ادارۂ تحقیق و تصنیف اسلامی کا ترجمان

سہ ماہی

تحقیقاتِ اسلامی

علی گڑھ

www.tahqeeqat.net

ISSN:2321-8339

جولائی۔ستمبر ۲۰۱۴ء

- اسلامی تاریخ میں ہجرت مدینہ کی اہمیت
  سید جلال الدین عمری
- مکی عہد میں تجارتی معاہدوں کی قریشی روایت
  پروفیسر محمد یسین مظہر صدیقی
- فتاویٰ عالم گیری۔ المسوّیٰ کا بنیادی ماخذ
  ڈاکٹر ضیاء الدین ملک فلاحی
- اجتہاد اور اس کا تاریخی پس منظر
  پروفیسر محمد انس حسان
- شیخ محمد الغزالیؒ اور ان کی تصنیف فقہ السیرۃ
  ڈاکٹر صفدر سلطان اصلاحی
- دورِ جدید کی چند مفسّر خواتین
  ڈاکٹر عفاف عبد الغفور حمید / ندیم سحر عنبرین
- تعارف و تبصرہ
  ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی

ادارۂ تحقیق وتصنیفِ اسلامی کا ترجمان

سہ ماہی

تحقیقاتِ اسلامی

علی گڑھ

جولائی ——————— ستمبر ۲۰۱۴ء

مدیر

سیّد جلال الدین عمری

معاون مدیر

محمد رضی الاسلام ندوی

نبی نگر (جمال پور)، پوسٹ بکس نمبر ۹۳، علی گڑھ - ۲۰۲۰۰۲

ISSN: 2321-8339

سہ ماہی تحقیقاتِ اسلامی علی گڑھ

جلد: ۳۳ شمارہ: ۳

رمضان المبارک ـــــــــــ ذی قعدہ ۱۴۳۵ھ

جولائی ـــــــــــ ستمبر ۲۰۱۴ء

- مجلہ کے تمام شمارے www.tahqeeqat.net پر لوڈ کر دیے گئے ہیں
- مقالہ نگار حضرات اپنے مقالات صرف tahqeeqat.@gmail.com پر ارسال کریں۔
- انتظامی امور سے متعلق رابطہ کے ذرائع:

فون: 0571-2902034 موبائل: 09897655171

ای میل: tahqeeqateislami@gmail.com tahqeeqat_islami@yahoo.com

زرِ تعاون

اندرونِ ملک

فی شمارہ	۴۰ روپے
سالانہ	۱۵۰ روپے
پانچ سال کے لیے	۶۰۰ روپے
سالانہ (لائبریریاں وادارے)	۲۰۰ روپے

برائے پاکستان

سالانہ (انفرادی)	۲۰/امریکی ڈالر
سالانہ (ادارے)	۲۵/امریکی ڈالر

برائے دیگر ممالک

سالانہ (انفرادی)	۲۵/امریکی ڈالر
سالانہ (ادارے)	۳۰/امریکی ڈالر

طابع وناشر سید جلال الدین عمری نے بھارت آفسیٹ دہلی-۶ سے چھپوا کر
ادارۂ تحقیق وتصنیفِ اسلامی، نبی نگر (جمال پور)، علی گڑھ سے شائع کیا

فہرست مضامین

حرف آغاز

اسلامی تاریخ میں ہجرتِ مدینہ کی اہمیت — سید جلال الدین عمری — ۵

تحقیق وتنقید

مکی عہد میں تجارتی معاہدوں کی قریشی روایت — پروفیسر محمد یٰسین مظہر صدیقی — ۱۷

فتاویٰ عالم گیری۔المسوّی کا ایک بنیادی ماخذ — ڈاکٹر ضیاء الدین ملک فلاحی — ۴۱

بحث ونظر

اجتہاد اور اس کا تاریخی ارتقائ — پروفیسر محمد انس حسان — ۵۷

سیر وسوانح

شیخ محمد الغزالی اور ان کی تصنیف فقہ السیرۃ ایک تعارف — ڈاکٹر صفدر سلطان اصلاحی — ۷۵

ترجمہ وتلخیص

دورِ جدید کی چند مفسّر خواتین — ڈاکٹر عفاف عبد الغفور حمید — ۸۹
مترجمہ: محترمہ ندیم سحر عنبرین

تعارف وتبصرہ

نسائیات — ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی — ۱۱۵

دارالمصنفین کی عربی خدمات — ،، ،، — ۱۱۷

خبرنامہ ادارۂ تحقیق وتصنیف اسلامی (۵۲) — ۱۲۰

مضامین کا انگریزی خلاصہ — ۱۲۱۔۱۲۸

اس شمارے کے لکھنے والے

۱۔ پروفیسر محمد یٰسین مظہر صدیقی

سابق چیرمین، شعبۂ اسلامک اسٹڈیز، مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ

mnz_comp@yahoo.in

۲۔ ڈاکٹر ضیاء الدین ملک فلاحی

استاد، شعبہ اسلامک اسٹڈیز، مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ

ziauddin.malik.falahi@gmail.com

۳۔ پروفیسر محمد انس حسّان

گورنمنٹ ڈگری کالج، جہانیاں، پاکستان

anskashmiri@gmail.com

۴۔ ڈاکٹر صفدر سلطان اصلاحی

ایسوسی ایٹ پروفیسر، شعبۂ کلیات، طبیہ کالج، مسلم یونی ورسٹی، علی گڑھ

۵۔ ڈاکٹر عفاف عبدالغفور حمید

اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ تفسیر وعلوم القرآن، کلیۃ الشریعۃ والدراسات الاسلامیۃ،

جامعہ شارقہ (U.A.E.)

۶۔ محترمہ ندیم سحر عنبریں

ریسرچ اسکالر، شعبۂ اسلامک اسٹڈیز، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

nadeemamber90@gmail.com

۷۔ محمد رضی الاسلام ندوی

سکریٹری تصنیفی اکیڈمی، جماعت اسلامی ہند، نئی دہلی

mrnadvi@yahoo.com

۸۔ سید جلال الدین عمری

صدر ادارۂ تحقیق وتصنیف اسلامی، علی گڑھ

اسلامی تاریخ میں ہجرتِ مدینہ کی اہمیت

سیّد جلال الدین عمری

عرب کی تاریخ ان کے کسی اہم واقعہ سے متعلق ہوتی تھی۔ جیسے حضرت ابراہیمؑ کے آتش نمرود سے صحیح سالم نکل آنے کا واقعہ۔ خانہ کعبہ کی تعمیر یا اس کے صدیوں بعد اصحاب الفیل کا واقعہ، جس میں ابرہہ کے ہاتھیوں کی فوج، جو خانہ کعبہ کو منہدم کرنے کے لیے آئی تھی، تباہ ہوگئی۔ یہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کا عظیم کرشمہ تھا۔ اس طرح کے بڑے واقعات سے عرب اپنی تاریخ بیان کرتے تھے۔ جیسے فلاں واقعہ اصحاب فیل کے واقعہ سے اتنی مدت قبل یا بعد میں پیش آیا۔

حضرت عمرؓ کے دور خلافت میں اس بات کی شدت سے ضرورت محسوس کی گئی کہ اسلامی تقویم کہاں سے شروع ہو اور اس کی تاریخ کا حساب کیسے رکھا جائے؟ آپ نے صحابہ کرام سے مشورہ کیا۔ کسی نے تجویز پیش کی کہ روم کی تاریخ کو اپنا لیا جائے۔ لیکن یہ بات سامنے آئی کہ ان کی تاریخ متعین نہیں ہے، بلکہ بدلتی رہتی ہے۔ کسی نے کہا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت کو اسلامی تاریخ کی بنیاد بنایا جائے۔ کسی نے مشورہ دیا کہ آپ کی وفات کو بنیاد مان لیا جائے۔ حضرت عمرؓ نے کہا کہ ہجرت کو اسلامی تاریخ کی بنیاد ہونا چاہیے، اس لیے کہ اس نے حق و باطل کے درمیان فرق کردیا۔ حضرت علیؓ کی بھی یہی رائے تھی کہ ہجرت کو اسلامی تاریخ کی بنیاد ہونا چاہیے، جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سرزمینِ شرک کو چھوڑ کر مدینہ تشریف لائے۔ اس پر اتفاق ہوگیا۔ یہ سن ۱۷ یا ۱۸ھ کا واقعہ ہے۔ صحابہ کرام نے سال کا آغاز محرم سے قرار دیا جو عربی تاریخ کا پہلا مہینہ ہے۔[۱]

۱۔ ہجری تاریخ کی تعیین کی بحث کے لیے ملاحظہ ہو طبری، تاریخ الامم والملوک: ۲/ ۳-۶

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا سفر ہجرت ماہ ربیع الاوّل میں شروع میں ہوا اور ۱۲/ ربیع الاوّل کو آپ کی مدینہ تشریف آوری ہوئی۔ ا؎

مکہ میں کام یابی کی بشارتیں

مکہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور صحابۂ کرام ؓ سخت آزمائشوں سے گزر رہے تھے۔ انہیں اسلام پر کھل کر عمل کرنے اور اس کی دعوت وتبلیغ کی اجازت نہیں تھی۔ آپ کے مخالفین کی پوری کوشش تھی کہ اسلام مکہ میں قدم نہ جمانے پائے اور ہمیشہ کے لیے اس کا خاتمہ ہوجائے۔ اس کے لیے روز مشورے ہوتے اور نت نئے اقدامات کیے جاتے تھے۔ یہ پورا دور مظلومیت کا دور تھا۔ کسی کو اس کی توقع نہیں تھی کہ یہ مظلومیت ختم ہوگی، اہل ایمان آزادی کی فضا میں سانس لیں گے، اسلام کو فروغ حاصل ہوگا اور وہ فتح و کام رانی سے ہم کنار ہوگا۔ ان نازک حالات میں قرآن نے بار بار کہا کہ حالات یقینا بدلیں گے، مخالف قوتیں اپنے عزائم اور منصوبوں میں ناکام ہوں گی اور اسلام کو سربلندی حاصل ہوگی۔ پورے زور اور قوت کے ساتھ کہا گیا: اللہ کے رسولوں کو اس کی نصرت حاصل رہی ہے، اب بھی حاصل ہوگی۔ یہاں مکی سورتوں سے بعض حوالے دیے جارہے ہیں:

إِنَّا لَنَنصُرُ رُسُلَنَا وَالَّذِيْنَ آمَنُوا فِيْ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ يَقُومُ الْأَشْهَادُ۔ (غافر:۵۱)

بے شک ہم مدد کرتے ہیں اپنے رسولوں کی اور ان لوگوں کی جو ایمان لائے، دنیا کی زندگی میں بھی اور اس روز بھی جب گواہ کھڑے ہوں گے۔

یہی بات ایک اور جگہ ان الفاظ میں بیان ہوئی ہے:

وَلَقَدْ سَبَقَتْ كَلِمَتُنَا لِعِبَادِنَا الْمُرْسَلِيْنَ۔ إِنَّهُمْ لَهُمُ الْمَنصُورُونَ۔ وَإِنَّ جُندَنَا لَهُمُ الْغَالِبُونَ۔ (الصّٰفّٰت:۱۷۱-۱۷۳)

ہمارا یہ فیصلہ ہمارے ان بندوں کے حق میں جو رسول بنائے گئے ہیں، پہلے ہی ہوچکا ہے کہ ان کی مدد ضرور ہوگی اور ہمارا لشکر ہی غالب ہوگا۔

ا؎ ابن حجر، فتح الباری: ۷/ ۶۳۲

ایک اور مقام پر فرمایا کہ یہ دورِ جور وستم ہمیشہ باقی نہیں رہے گا، ظلم کی چکی یوں ہی نہیں چلتی رہے گی، ظالموں کے سامنے ان کا انجامِ بد بہت جلد آنے والا ہے:

وَسَيَعْلَمُ الَّذِيْنَ ظَلَمُوا أَيَّ مُنقَلَبٍ يَنقَلِبُونَ ۔(الشعرا:۲۲۷)

جن لوگوں نے ظلم (اور ہٹ دھرمی) کی راہ اختیار کی ہے انہیں جلد ہی معلوم ہوجائے گا کہ وہ کس انجام سے دوچار ہونے والے ہیں۔

یہ بات ایک اور موقع پر ان الفاظ میں بیان ہوئی ہے:

سَيُهْزَمُ الْجَمْعُ وَيُوَلُّونَ الدُّبُرَ۔ (القمر:۴۵)

بہت جلد یہ جتھا شکست کھا جائے گا اور وہ پیٹھ پھیر کر بھاگیں گے۔

فرمایا گیا کہ مخالفین نوشتۂ دیوار کیوں نہیں پڑھ رہے ہیں کہ ان کی تمام تدابیر کے باوجود اللہ کے دین کو پھیلنے اور عام ہونے سے روکنا ان کے لیے ممکن نہیں ہے۔ کیا وہ نہیں دیکھ رہے ہیں کہ خود ان ہی کے گھروں میں اس دین کے ماننے والے پیدا ہورہے ہیں اور اس کی حمایت میں کھڑے ہورہے ہیں، مکہ کے اطراف میں اسلام پھیل رہا ہے، زمین ان کے قدموں کے نیچے سے کھسک رہی ہے، پھر بھی وہ اس خیالِ خام میں ہیں کہ ان کا اقتدار لازوال ہے اور ان کا غلبہ وتسلط باقی رہے گا۔(الرعد:۴۱، الانبیائ: ۴۴)

مکہ میں غلبۂ دین کی جو بشارت دی گئی اور مخالفین کو جس انجام سے آگاہ کیا گیا، ہجرت کے بعد اس کا ظہور ہوا اور اسلام عملاً غالب ہوگیا۔

مکہ سے ہجرت کی ترغیب

مکہ میں مسلمان جن دشوار گزار اور صبر آزما حالات سے گزر رہے تھے ان میں کہا گیا کہ ہوسکتا ہے کہ یہ سرزمین تم پر مزید تنگ ہوجائے اور تمہیں اپنے دین کی خاطر اسے چھوڑنا پڑے، عزیزوں اور رشتہ داروں کی جدائی اور مال و جائداد کا خسارہ برداشت کرنا پڑے۔ اگر تم نے یہ ہمت کی اور اللہ کے لیے ہجرت کی تو اللہ کی نصرت تمہیں حاصل ہوگی، اس کے بعد تمہاری مظلومی کا دور ختم ہوگا، غلبہ اور سربلندی کی راہ ہموار ہوگی اور دنیا وآخرت

کی فلاح تمہارے حصہ میں آئے گی۔ چناں چہ سورہ نحل میں، جو مکی ہے، ارشاد ہے:

وَالَّذِيْنَ هَاجَرُوا فِي اللّٰهِ مِنْ بَعْدِ مَا ظُلِمُوا لَنُبَوِّئَنَّهُمْ فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَلَأَجْرُ الْآخِرَةِ أَكْبَرُ لَوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ۔ الَّذِيْنَ صَبَرُوا وَعَلَى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُونَ۔ (النحل: ۴۱۔۴۲)

جن لوگوں نے اللہ کے لیے ہجرت کی ظلم و زیادتی کی وجہ سے جو ان پر کیا گیا تو ہم دنیا میں ان کو بہترین ٹھکانا دیں گے اور آخرت کا اجر بہت بڑا ہے۔ کاش یہ (مخالفین) جانتے۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے تکلیفیں برداشت کیں اور جو اپنے رب پر توکل کرتے ہیں۔

یہ بات اس وقت کہی جارہی تھی جب کہ مکہ سے اہل ایمان خاموشی سے حبشہ ہجرت کررہے تھے۔ انہوں نے بعد میں مدینہ بھی ہجرت کی۔ اس طرح انہیں دو ہجرتوں کا ثواب حاصل ہوا۔[۱]

جن لوگوں نے اللہ کی راہ میں اور اس کی رضا کے لیے ہجرت کی اور گھر بار چھوڑا ان سے دنیا میں 'بہترین ٹھکانے' کا وعدہ کیا گیا۔ اس سے مدینہ مراد ہوسکتا ہے، جو مہاجرین کا مرکز بنا اور جہاں اسلامی ریاست کا قیام عمل میں آیا۔ اس کے مفہوم میں فتح و نصرت اور اسلامی اقتدار کی توسیع بھی شامل ہے، معیشت کی فراخی اور خوش حالی بھی اسی کا ایک حصہ ہے۔ اس سے نیک نامی اور ذکر خیر بھی مراد لیے گئے ہیں۔ مفسرین کے ہاں ان مختلف پہلوؤں کا ذکر موجود ہے۔ ان سب کی گنجائش ہے۔[۲]

سورۂ عنکبوت مکی سورت ہے۔ یہ اس دور میں نازل ہوئی جب اہل ایمان پر جور وتشدد آخری حد کو پہنچ رہا تھا۔ ان حالات میں کہا گیا کہ آزمائشیں اور امتحانات اس راہ

۱۔ بعض حضرات کی رائے ہے کہ ان آیات میں ہجرتِ مدینہ کا ذکر ہے، لیکن سورۂ نحل مکی ہے۔ اس میں ہجرتِ مدینہ کا حوالہ نہیں آسکتا۔ مفسّر ابن عطیہ اندلسی کہتے ہیں کہ ان آیات میں ان اصحاب کا ذکر ہے جنھوں نے حبشہ ہجرت کی۔ یہی جمہور کی رائے ہے اور یہی صحیح ہے، اس لیے کہ اس آیت کے نزول کے وقت ہجرتِ مدینہ واقع نہیں ہوئی تھی۔ ابن عطیہ، المحرر الوجیز: ۵/ ۳۵۶۔ یہی بات ماوردی نے بھی کہی ہے کہ آیت کا تعلق ہجرت حبشہ سے ہے۔ تفسیر الماوردی: ۲/ ۳۹۰

۲۔ ماوردی، النکت والعیون: ۲/ ۳۹۰۔۳۹۱

کا لازمی حصہ ہیں۔ اس سے ایمان میں اخلاص اور عدم اخلاص کا ثبوت فراہم ہوتا ہے۔اسی سلسلہ میں کہا گیا کہ مکہ کی زمین تمہیں برداشت نہیں کررہی ہے تو اسے چھوڑ کر کسی ایسی جگہ چلے جاؤ جہاں تم اللّٰہِ واحد کی عبادت کرسکو۔ ارشاد ہے:

یٰعِبَادِیَ الَّذِیْنَ آمَنُوا إِنَّ أَرْضِیْ وَاسِعَةٌ فَإِیَّایَ فَاعْبُدُونِ ۔(العنکبوت:۵۶)

اے میرے بندو جو ایمان لائے ہو! میری زمین کشادہ ہے۔پس تم میری ہی عبادت کرو۔

آدمی یہ سوچ سکتا ہے کہ گھر بار ،خویش واقارب، زمین جائیداد اور کاروبار چھوڑ کر کسی اجنبی جگہ چلا جائے تو روزی روٹی کا کیا ہوگا اور زندگی کیسے گزرے گی؟ اس کے جواب میں فرمایا گیا کہ دیکھو، دنیا میں کتنے ہی جان دار ہیں جو اپنا رزق اپنے سر پر اٹھائے نہیں پھرتے ۔ وہ بھوکے نہیں مرتے۔ اللہ ان کو رزق دیتا ہے۔ وہ تم کو بھی رزق دے گا۔ (العنکبوت:۶۰)

اس طرح مکہ میں یہ ماحول بنایا گیا کہ اللہ کے دین کی خاطر ہر تکلیف برداشت کی جاسکتی ہے۔اس کے لیے گھر بار چھوڑنا اور ترک وطن کرنا پڑے تو ایمان کا تقاضا ہے کہ آدمی یہ اقدام بھی کرگزرے۔

ہجرتِ مدینہ کے اشارے

سورۂ بنی اسرائیل مکی سورت ہے۔اس میں ہجرت مدینہ کا پس منظر اور مستقبل میں اس کے اثرات کا تفصیل سے ذکر ہے۔

مکہ میں اسلام پر آزادی سے عمل کرنے اور اس کی دعوت وتبلیغ کی راہیں مسدود ہورہی تھیں۔ آپؐ اور آپ کے اصحاب سخت آزمائشوں اور مشکلات سے گزر رہے تھے۔مشرکین چاہتے تھے کہ مکہ میں آپ کے قدم کسی طرح جمنے نہ پائیں۔اس کے لیے وہ ہزار تدبیریں کررہے تھے۔قرآن نے کہا: انہیں معلوم ہونا چاہیے کہ آپ کو مکہ سے نکالنے کے بعد اللہ تعالیٰ کے قانون کے تحت وہ خود بھی دیر تک یہاں نہیں رہ پائیں گے:

وَإِن كَادُواْ لَيَسْتَفِزُّونَكَ مِنَ الأَرْضِ لِيُخْرِجُوكَ مِنْهَا وَإِذاً لاَّ يَلْبَثُونَ خِلافَكَ إِلاَّ قَلِيلاً۔ سُنَّةَ مَن قَدْ أَرْسَلْنَا قَبْلَكَ مِن رُّسُلِنَا وَلاَ تَجِدُ لِسُنَّتِنَا تَحْوِيلاً۔ (بنی اسرائیل:۷۶،۷۷)

وہ تو یہ چاہتے تھے کہ تمہیں دق کر کے اس زمین (مکہ) سے نکال دیں۔ اس صورت میں تمہارے بعد یہ بھی وہاں کم ہی ٹھہر پائیں گے۔ یہ اللہ کی سنت ہے اپنے رسولوں کے سلسلہ میں جنہیں ہم نے تم سے پہلے بھیجا ہے۔ اس میں تم کوئی تبدیلی نہ پاؤ گے۔

حکم ہوا، آپ دعا کریں:

وَقُل رَّبِّ أَدْخِلْنِي مُدْخَلَ صِدْقٍ وَأَخْرِجْنِي مُخْرَجَ صِدْقٍ وَاجْعَل لِّي مِن لَّدُنكَ سُلْطَاناً نَّصِيراً۔ وَقُلْ جَاءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ إِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوقاً۔ (بنی اسرائیل:۸۰۔۸۱)

اور کہو اے میرے رب! مجھے داخل کر سچائی کے ساتھ۔ میرا نکلنا بھی سچائی کے ساتھ ہو۔ تو مجھے اپنی طرف سے ایک اقتدار کو مددگار بنادے۔ کہو: حق آ گیا اور باطل مٹ گیا۔ بے شک باطل تو مٹنے ہی والا ہے۔

ہجرت دراصل صداقت اور راستی کا سفر تھا۔ ارشاد ہے کہ دعا کیجیے کہ آپ کا مدینہ پہنچنا اور مکہ چھوڑنا راستی کے لیے ہو، اس میں خلوص ہو اور نیک جذبہ ہو۔ دعا کیجیے کہ اللہ تعالیٰ سیاسی طاقت کو تمہارا مددگار بنادے۔

ان آیات میں پہلے مدینہ کا ذکر ہے، جو دارالہجرت تھا، بعد میں مکہ کا ذکر آیا ہے، جہاں سے آپ نے ہجرت کی تھی۔ اس تقدیم کی وجہ ہجرت مدینہ کی اہمیت ہے۔[۱]

یہ اس امر کا اظہار بھی تھا کہ ہجرت مدینہ سے باطل کے ختم ہونے کا آغاز ہوجائے گا، فتح ونصرت کی راہیں ہموار ہوں گی اور مستقبل اسلام کا ہوگا۔

ہجرت مدینہ

قریش نے دیکھا کہ مدینہ کے قبائل آپ کے ہم نوا ہوگئے ہیں اور آپ کے ساتھی آہستہ آہستہ مدینہ کا رخ کررہے ہیں تو انہیں اندیشہ لاحق ہوا کہ آپ بھی کسی وقت

۱۔ ابن عطیۃ، المحرر الوجیز: ۵/ ۵۳۰

مدینہ پہنچ جائیں گے، اس کے بعد حالات دوسرا رخ اختیار کر سکتے ہیں، آپ ہمارے خلاف محاذ آرائی بھی کر سکتے ہیں۔ اس سلسلے میں مشورے کے لیے مختلف قبائل کے سردار 'دارالندوہ' میں جمع ہوئے اور مشورہ کرنے لگے۔[۱]

کسی نے کہا: ان کو زنجیر سے باندھ دو اور کسی مکان میں ڈال دو۔ جس طرح نابغہ اور زہیر جیسے زبان آور شعراء ختم ہو گئے، یہ بھی دنیا سے چلے جائیں گے، کسی نے کہا: انہیں مکہ سے نکال باہر کرو، ہمیں اس سے کوئی غرض نہیں کہ وہ کہاں گئے اور ان کا کیا انجام ہوا۔ ابوجہل نے کہا: میری رائے یہ ہے کہ ہم اپنے اپنے قبیلے کے ایک معزز اور شریف نوجوان کا انتخاب کریں اور ہر ایک کے ہاتھ میں دھاری دار تلوار ہو اور وہ سب مل کر ایک ساتھ آپ پر حملہ کر کے ختم کر دیں۔ اس طرح ان کے قتل میں تمام قبائل شریک ہوں گے۔ بنو عبد مناف ان سب کا مقابلہ نہ کر سکیں گے اور دیت پر آمادہ ہو جائیں گے اور وہ ادا کر دی جائے گی۔ اس پر سب کا اتفاق ہو گیا۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مشرکین کے اس منصوبے سے آگاہ فرما دیا۔ آپ نے حضرت علیؓ کو اپنے بستر پر سونے کی ہدایت فرمائی اور مکان سے اس طرح نکل گئے کہ مشرکین، جو مکان کو گھیرے ہوئے تھے، انہیں اس کا پتہ نہ چلا اور آپ حضرت ابوبکرؓ کے ساتھ سفر ہجرت پر روانہ ہو گئے۔ صبح جب انہوں نے آپ پر حملہ کرنا چاہا تو دیکھا کہ آپ کے بستر پر حضرت علیؓ آرام کر رہے ہیں۔ اس سے ان کے ہوش اڑ گئے اور وہ آپ کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے، لیکن ناکام رہے۔[۲]

۱۔ 'دارالندوہ' قصی بن کلاب کا گھر تھا۔ قریش اہم معاملات میں مشورے کے لیے یہاں جمع ہوتے اور فیصلے کرتے تھے۔ ابن ہشام، سیرۃ النبی: ۲ / ۹۴

۲۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو مسند احمد، مسند ابن عباس، حدیث نمبر ۳۲۴۱۔ ابن جریر، جامع البیان فی تفسیر القرآن: ۹ / ۱۴۹۔۱۵۱۔ ابن ہشام، سیرۃ النبی: ۲ / ۹۴۔۹۷۔ اسی روایت میں ہے کہ مجلس میں نجد کے ایک شیخ کی شکل میں شیطان موجود تھا۔ اس نے ابوجہل کی رائے کی پُرزور تائید کی۔ قاضی عیاض (؟) نے کہا ہے کہ یہ واقعہ، جو حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے، قرآن کے مطابق ہے۔ البتہ شیطان کا انسان کی صورت میں آنا اور تائید کرنا غلط ہے۔ امام رازیؒ فرماتے ہیں کہ یہ اعتراض صحیح نہیں ہے۔ یہ ناممکن نہیں ہے کہ شیطان کسی انسان کی شکل میں آئے اور تجویز کی تائید کرے۔ التفسیر الکبیر: جلد ۸، جزء ۱۵، ص ۱۲۴۔۱۲۵

قرآن مجید نے اس کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:

وَإِذْ يَمْكُرُ بِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُواْ لِيُثْبِتُوكَ أَوْ يَقْتُلُوكَ أَوْ يُخْرِجُوكَ وَيَمْكُرُونَ وَيَمْكُرُ اللّٰهُ وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمٰكِرِيْنَ۔ (الانفال:۳۰)

یاد کرو جب تمہارے بارے میں وہ لوگ تدبیر کر رہے تھے جنہوں نے کفر کیا ہے کہ تمہیں قید کردیں یا قتل کردیں یا تمہیں مکہ سے نکال دیں۔ وہ اپنی تدبیر کر رہے تھے اور اللہ تعالیٰ اپنی تدبیر کر رہا تھا۔ اللہ تعالیٰ بہترین تدبیر کرنے والا ہے۔

اسلام کی وسعت

ہجرت کے بعد اسلام نے جو وسعت اختیار کی اور اس کے جو تہذیبی، سماجی اور سیاسی رخ نمایاں ہوئے اس سے مکی اور مدنی دور کا فرق واضح ہوتا ہے۔ ان میں سے چند ایک کا یہاں ذکر کیا جا رہا ہے۔

تکمیلِ دین

مکہ میں اسلام کی اصولی تعلیمات نازل ہوتی رہیں، جن میں توحید، رسالت اور آخرت کو دلائل کے ساتھ پیش کیا گیا اور مخالف فکر و خیال کی تردید کی گئی، اصولِ اخلاق بیان ہوئے، عدل و انصاف کے قیام اور حقوق انسانی کی حفاظت پر زور دیا گیا۔ اسی کے ساتھ اللہ کے دین پر صبر و ثبات کی تاکید کی گئی۔ انبیاء سابقین کی تعلیمات، راہِ خدا میں ان کی جدوجہد اور استقامت کے حوالے دیے گئے۔ مدینہ میں ان تعلیمات کی اساس پر مکمل قانون حیات اور نظام شریعت عطا کیا گیا۔ اس میں عبادات (نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج جیسے تعبّدی امور) کی تفصیل تھی۔ خاندان کی تعمیر و تشکیل کے قواعد و ضوابط، معیشت و معاشرت کے قوانین، سیاست و حکم رانی کے راہ نما اصول، حدود و تعزیرات اور ان کے شرائط جیسے تمام انفرادی و اجتماعی امور شامل تھے۔ اس طرح زندگی

کے ہر شعبہ میں قانون شریعت نافذ ہوا اور تمام قوانین پر اس کی برتری قائم ہوگئی۔ حجۃ الوداع کے موقع پر اعلان کر دیا گیا:

الْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَأَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الإِسْلاَمَ دِيْناً۔ (المائدۃ: ۳)	آج میں نے تمہارے لیے تمہارا دین مکمل کر دیا ہے اور تم پر اپنا احسان پورا کر دیا ہے اور تمہارے لیے دین اسلام کو پسند کیا ہے۔

یہ تکمیلِ دین کا اعلان تھا۔ یہ پوری زندگی کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے آخری راہ نمائی تھی۔ اس کے بعد کسی اور راہ نمائی کی ضرورت باقی نہیں رہی۔

سیاسی اقتدار

مکہ میں انتہائی سخت اور نازک حالات کے باوجود اہل ایمان کو غلبہ اور کامرانی کی بشارت دی گئی۔ ہجرت مدینہ کے بعد اعلان کیا گیا کہ اللہ کا دین غالب ہوکر رہے گا۔ دنیا کی کوئی طاقت اس کی راہ میں مزاحم نہیں ہوسکتی۔ اسے زیر کرنے کی تمام کوششیں اور تدبیریں ناکام ہوں گی:

يُرِيْدُونَ أَن يُطْفِؤُواْ نُورَ اللّٰهِ بِأَفْوَاهِهِمْ وَيَأْبَى اللّٰهُ إِلاَّ أَن يُتِمَّ نُورَهُ وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُونَ۔ هُوَ الَّذِيْ أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهِ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُونَ۔ (التوبۃ: ۳۲، ۳۳)[۱]	وہ چاہتے ہیں کہ اللہ کے نور کو اپنے مونھ سے (پھونک مار کر) بجھادیں اور اللہ کا فیصلہ ہے کہ وہ اپنے نور کو مکمل کر کے رہے گا، چاہے کافروں کو یہ ناپسند ہی کیوں نہ ہو۔ وہ اللہ ہی کی ذات ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا ہے، تاکہ اسے تمام دینوں پر غالب کردے، چاہے مشرکین اسے ناپسند ہی کیوں نہ کریں۔

---

[۱] یہ آیت الفاظ کے تھوڑے سے فرق کے ساتھ سورۃ الفتح (آیت ۲۸) اور سورۃ الصّف (آیت ۹) میں بھی آئی ہے۔

مکہ میں اہل ایمان کو اقتدار حاصل نہ تھا۔ مدینہ میں انہیں اقتدار عطا کیا گیا۔ مکہ میں وہ آزادی سے اللہ کے دین پر عمل نہیں کر پا رہے تھے۔ اب وہ پورے اطمینان سے اس پر عمل کر سکتے تھے:

وَعَدَ اللّٰہُ الَّذِیْنَ آمَنُوا مِنکُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَیَسْتَخْلِفَنَّھُم فِیْ الْأَرْضِ کَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِیْنَ مِن قَبْلِھِمْ وَلَیُمَکِّنَنَّ لَھُمْ دِیْنَھُمُ الَّذِیْ ارْتَضٰی لَھُمْ وَلَیُبَدِّلَنَّھُم مِّن بَعْدِ خَوْفِھِمْ أَمْناً یَعْبُدُونَنِیْ لَا یُشْرِکُونَ بِیْ شَیْئاً وَمَن کَفَرَ بَعْدَ ذَلِکَ فَأُوْلَئِکَ ھُمُ الْفٰسِقُونَ۔(النور:۵۵)

اللہ نے وعدہ کیا ہے ان لوگوں سے جو تم میں سے ایمان لائے ہیں اور جنہوں نے نیک اعمال انجام دیے ہیں ان کو وہ زمین میں خلیفہ بنائے گا جس طرح اس نے ان سے پہلے کے لوگوں کو خلیفہ بنایا تھا اور ان کے دین کو ضرور جما دے گا جسے اس نے ان کے لیے پسند کیا ہے اور ان کی حالت خوف کو ضرور حالتِ امن میں تبدیل کر دے گا۔ وہ میری عبادت کریں گے اور میرے ساتھ کسی کو شریک نہیں کریں گے۔ جو اس کے بعد کفر کا راستہ اختیار کریں وہی فاسق ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا یہ وعدہ پورا ہوا اور اہل ایمان کو زمین کے ایک بڑے حصہ پر اقتدار حاصل ہوا۔ سن ۶ ھ میں صلح حدیبیہ ہوئی، جس میں اسلام کو ایک سیاسی طاقت کی حیثیت سے اہل مکہ نے تسلیم کیا اور وسیع پیمانہ پر اسلام کی دعوت کے مواقع حاصل ہوئے۔ دو سال بھی اس پر گزرنے نہیں پائے تھے کہ سن ۸ھ میں فتحِ مکہ کے بعد جوق در جوق قبائل کے قبائل اسلام میں داخل ہونے لگے اور فتح و نصرت کا منظر ہر طرف دیکھا جا رہا تھا:

إِذَا جَاء نَصْرُ اللّٰہِ وَالْفَتْحُ۔وَرَأَیْتَ النَّاسَ یَدْخُلُونَ فِیْ دِیْنِ اللّٰہِ أَفْوَاجاً۔فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّکَ وَاسْتَغْفِرْہُ إِنَّہُ کَانَ تَوَّاباً۔(النصر)

دعوتِ عام

مکہ ہی میں اسلام کو ایک عالم گیر اور ابدی دین حق کی حیثیت سے پیش کیا گیا، لیکن عملاً اس کی دعوت سرزمین مکہ اور حجاز کے بعض علاقوں تک محدود رہی۔ ہجرت کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا کی دوسری قوموں سے خطاب کیا اور ان کے سربراہوں کو خطوط تحریر کیے، انہیں اسلام کی براہ راست دعوت دی اور اس سلسلے کے ضروری اقدامات کیے۔

معاشی خوش حالی

ہجرت کے بعد اسلامی ریاست کا قیام عمل میں آیا تو دنیا نے دیکھا کہ یہ معاشی لحاظ سے بھی خوش حال ریاست ہے۔ جس دعوت کا آغاز انتہائی غربت و افلاس اور بے کسی کے کے عالم میں ہوا وہ ایک فلاحی ریاست قائم کرنے میں کامیاب ہے۔ قرآن مجید نے مکی اور مدنی دور کے اس فرق کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

وَاذْكُرُوا إِذْ أَنتُمْ قَلِيلٌ مُّسْتَضْعَفُونَ فِي الْأَرْضِ تَخَافُونَ أَن يَتَخَطَّفَكُمُ النَّاسُ فَآوَاكُمْ وَأَيَّدَكُم بِنَصْرِهِ وَرَزَقَكُم مِّنَ الطَّيِّبَاتِ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ۔ (الانفال:۲۶)

اس وقت کو یاد کرو جب تم تعداد میں تھوڑے تھے، زمین (مکہ) میں دبے ہوئے اور مغلوب تھے، تمہیں ڈر لگا رہتا تھا کہ لوگ اچانک تمہیں اچک نہ لے جائیں۔ اس کے بعد اللہ نے تمہیں (مدینہ میں) جگہ دی، اپنی نصرت سے تقویت پہنچائی اور پاک چیزیں کھانے کے لیے عطا کیں، تاکہ تم شکر ادا کرو۔

ہجرت کی تفصیل سیرت کی کتابوں میں ملتی ہے۔ یہاں قرآن مجید سے اس کے اسباب و محرکات اور نتائج کا ذکر کیا گیا ہے۔ ان میں اسلام کی دعوت سے لے کر ہجرت تک ایک فطری ترتیب نظر آتی ہے۔ مکہ میں سخت مشکلات کے باوجود کارِ دعوت

جاری رہا۔قرآن نے بار بار کہا کہ اس کا بہتر انجام سامنے آئے گا،مخالفین اپنی کوششوں میں ناکام ہوں گے اور اسلام سربلند ہوگا۔اس کے لیے جو تدابیر اختیار کی جاسکتی تھیں، وہ اختیار کی گئیں۔ان ہی میں ہجرتِ حبشہ اور ہجرتِ مدینہ بھی شامل ہے۔یہیں سے مخالفین کی ناکامی اور اسلام کی سربلندی کا آغاز ہوتا ہے۔اس سے بعض مستشرقین کے اس فاسد خیال کی تردید ہوتی ہے کہ مکہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیثیت ایک داعی اور مصلح کی تھی اور مدینہ میں آپ ایک جنگ جو اور خوں خوار شخص کی شکل میں سامنے آتے ہیں۔قرآن شروع ہی سے غلبۂ دین کا اعلان کرتا رہا ہے۔ہجرتِ مدینہ کے بعد اس کی راہ ہموار ہوئی اور اللہ کا دین عملاً غالب ہوا۔ہجرتِ مدینہ اسلامی تاریخ میں ایک سنگ میل ہے، اسی لیے وہ اسلامی تاریخ کے لیے بنیاد قرار پائی۔

☆☆☆

اسلام اور مشکلاتِ حیات

از

مولانا سید جلال الدین عمری

اس دنیا میں اللہ تعالیٰ کے نافرمانوں پر مشکلات اور مصائب کیوں آتے ہیں؟ اللہ تعالیٰ کے نیک بندوں کو ملّی اور اجتماعی، شخصی اور انفرادی مشکلات سے کیوں گزارا جاتا ہے؟ امراض، جسمانی تکالیف، مالی مشکلات، حادثات اور صدمات میں ایک مومن کا کیا رویہ ہونا چاہئے؟ مرض اور مشکلاتِ حیات میں خودکشی کیوں ناجائز ہے؟ مرض کی شدّت میں کسی کی جان کیوں نہیں لی جاسکتی؟ یہ کتاب قرآن وحدیث کی روشنی میں ان سوالات کے جوابات فراہم کرتی ہے۔مؤثر اندازِ بیان، دل نشیں بحث اور علمی اسلوب

آفسیٹ کی حسین طباعت، خوب صورت سرورق، صفحات: ۴۸ قیمت ۲۵=/ روپے

=※ ملنے کے پتے =※

ادارۂ تحقیق وتصنیف اسلامی، پوسٹ بکس نمبر: ۹۳، علی گڑھ۔۲

مرکزی مکتبہ اسلامی پبلیشرز، دعوت نگر ابوالفضل انکلیو، نئی دہلی۔۲۵

مکی عہد میں تجارتی معاہدوں کی قریشی روایت

پروفیسر محمد یٰسین مظہر صدیقی

قریشی تجارت کا سرنامہ بیت اللہ الحرام ہے۔ اسی سے ان کے سالانہ تجارتی سفروں اور دوسری سرگرمیوں کا تعلق جڑا ہوا ہے۔قرآن مجید کی سورۂ ایلاف کی اولین دو آیاتِ کریمہ میں قریش کی صرف تالیف کی خاطر سردی گرمی کے سفر کا ذکر اسے بہت ہی قدیم بتاتا ہے۔ا؎ روایاتِ سیرت و تاریخ اور احادیث نبوی اور ان کی شروح سے قریشی تجارت کی متعدد جہات کا پتہ چلتا ہے۔ ان کا ابھی تک جامع تجزیہ نہیں کیا گیا ہے۔ ان جہات میں مقامی، قومی، ملک گیر اور بین الاقوامی تجارت اور قریشی کاروباری سرگرمیوں کا ایک پیچیدہ مگر مربوط و منظم نظام شامل ہے۔ جنوبی عرب سے شمالی ساحلی پٹی سے گذر کر شام تک جانے والی شاہ راہِ تجارت کو بالعموم مغربی شاہ راہِ تجارت کہا جاتا ہے اور وہ معروف بھی ہے۔مگر حبشہ کی سرزمین سے شروع ہونے والی شاہ راہِ تجارت، جو بحر قلزم کو پار کرکے وسطی عرب خاص کر نجد کے راستے ایران جانے والی شاہ راہ ہے، کم مشہور ہے۔قریشی قومی تجارت کے اموال، ان کی منڈیوں، کاروانوں، ان کی ساخت و سامان اور متعدد دوسری چیزوں کا مطالعہ ابھی تک بہت کم کیا گیا ہے۔۲؎

مکی تجارتِ قریش ہو یا کسی دوسرے قبیلے اور علاقے کی کاروباری سرگرمی، سخت جغرافیائی حالات میں کسی اکیلے فرد وطبقہ کے بس میں نہ تھی، وہ باہمی تعاون، قبائلی اشتراک، تجارتی منڈیوں کے افراد و طبقات کی امداد اور مختلف علاقوں کے شیوخ و سلاطین کے 'اجازۂ' کے محتاج تھے۔ اسی ناگزیر ضرورت نے عرب وعجم کے تاجروں کو ایک دوسرے سے تجارتی شراکت کے معاہدے کرنے پر مجبور کیا۔ وہ دوطرفہ ہی

نہیں، مختلف الاطراف بھی تھے۔ ایک طرف تو شہر و علاقہ خاص کر قریشِ مکہ کے دو تاجر ایک دوسرے سے ندیمی اور تجارتی شراکت کا معاہدہ کرتے تھے۔ وہ زبانی و تحریری دونوں ہوتا تھا۔ دوسری طرف ایک شہر کے تجّار اور کاروباری افراد دوسرے شہر و قبیلہ کے تاجروں اور کاروباریوں سے بھی ندیمی اور شراکت کے معاہدے استوار کرتے تھے۔ ایک تیسری جہت یہ تھی کہ وہ اپنی گزرگاہوں کے قرب و جوار میں آباد قبیلوں اور ان کے سرداروں سے اپنے کاروانوں کے تحفظ کے معاہدے بھی کرتے تھے۔ تجارتی مراکز کے حکم رانوں سے تجارتی مراعات کے معاہدے ان کو چوتھی جہت بخشتے تھے کہ وہ فروغ تجارت کے لیے ہی نہیں، اس کی بقا اور وجود کے لیے بھی ضروری تھے۔ ۳؎

جاہلی تجارتی پس منظر

عہدِ نبوی کے مکی اور مدنی دونوں زمانی اور مکانی تجارتی سرگرمیوں کا اٹوٹ رشتہ جاہلی عربوں کے قدیم ترین زمانوں سے وابستہ ہے۔ دوسری تمام تجارتی کارروائیوں کی مانند ان کی تجارتی مفاہمت و معاہدہ کی روایات قدیم جاہلی عربوں سے ان کو وراثت میں سماجی روایات کے ساتھ ملی تھیں۔ قریشی تجارت اور اس سے وابستہ تمام سرگرمیوں کا ذکر زیادہ محفوظ ہے کہ ان کا ناگزیر رشتۂ ارتباط غبارِ راہ کو فروغِ وادیٔ بطحا بخشنے والی ذات سے ہے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وجودِ مسعود اور بعثتِ بابرکت کی وجہ ہی سے قریشِ مکہ کے اکابر اور اجداد و آباءِ خاندان کا نام اور کام دونوں تاریخ کی روشنی میں چمکا۔ روایتی سیرت نگاروں اور عام تاریخ نویسوں نے اس غلط روایت کو واقعہ بنانے کی کوشش کی کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جد امجد جناب ہاشم بن عبدمناف نے رحلۃ الشتاء والصیف کی بنا ڈالی۔ ۴؎ حالاں کہ تمام روایاتِ سیرت و تاریخ اور شواہدِ حدیث واضح کرتے ہیں کہ 'موسمِ سرما و گرما' کے سفر کی داغ بیل ان سے بہت پہلے زمانے میں ڈالی جا چکی تھی۔ اس کا قطعی زمانہ متعین کرنا مشکل ہے، تاہم یہ حتمی ہے کہ وہ خانہ کعبہ کے حج کی خاطر اذانِ ابراہیمی کے معاً بعد اور قریش کے اتحاد و تنظیم کے زمانے کا ایک ارتقا

ہے۔قریشی خاندانوں کے 'مجمّع' جناب نضر بن کنانہ/ فہر بن مالک بن نضر تھے اور ان میں سے موخرالذکر کو قریشی اتحاد کے عروج وقوت کا زیادہ شرف دیا جاتا ہے۔ان کے زمانے سے چند پیڑھیوں کے بعد قصی بن کلاب بن مرہ بن لوئ بن غالب بن فہر کو قریش قبیلہ کا طاقت ورترین شیخ اور جدید مکہ شہر کا بانی سمجھا جاتا ہے۔ان اجدادِ قدیم کے زمانوں میں قریشی تجارتی سرگرمیوں کا ذکر اپنی مختلف جہات کے ساتھ ملتا ہے اور وہ ثابت کرتا ہے کہ اس دوگونہ سفر کا اہتمام دور قدیم کا ہے۔ابن اسحاق نے ان ہی اسباب وشواہد کی وجہ سے جناب ہاشم بن عبد مناف کی، دونوں سفروں کی ایجاد کا ذکر مزعومہ قرار دیا ہے اور اسے ہاشمی بزرگ پرستی بتایا ہے۔۵؎ دوسرے شواہد وروایات سے بھی پتہ چلتا ہے کہ جناب ہاشم نے اپنے والد ماجد جناب عبد مناف بن قصی کے تجارتی دوست وندیم کو ورثہ میں پایا تھا۔ یثرب کے قبیلہ خزرج کے خاندان بنو عدی بن النجار کے شیخ عمرو بن زید نجاری خزرجی اصلاً عبد مناف کے تجارتی دوست وشریک اور ندیم تھے اور ان کی موت کے بعد جناب ہاشم نے ان سے تجارتی شراکت ومعاہدہ استوار کیا اور ان کی دختر سلمیٰ بنت عمرو نجاری/ خزرجی سے شادی کر کے اسے مصاہرت (ازدواج) سے اور مضبوط کر دیا۔روایات میں یہ صراحت ملتی ہے کہ جناب ہاشم بن عبد مناف اپنی تجارتی سرگرمی اور خاص کر شامی تجارت کے ایک سفر کے دوران یثرب پہنچے اور یہ رشتہ استوار کیا تھا۔ ظاہر ہے کہ ان سے قبل ان کے والد ماجد اور دادا کے علاوہ دوسرے اکابر واجداد قریش یثرب سے تجارتِ شامی کے لیے گذرتے اور اس کی منڈی سے مال لیتے تھے اور شام کے شہروں خاص کر بصریٰ، غزہ، بلقاء وغیرہ میں تجارت کرتے تھے۔ یہ تجارت وہاں کے تاجروں اور حکم رانوں سے مفاہمت ومعاہدے کے بغیر ممکن نہیں تھی۔۶؎

بین الاقوامی تجارتی معاہدے

بیش ترم آخذِ سیرت وتاریخ نے روایت بیان کی ہے کہ جناب ہاشم نے جب موسم سرما وگرما کی سنتِ تجارت قائم کردی تو اس کے جلو میں شامی بادشاہوں (ملوک

الشام) سے حفاظت وعصمت کا معاہدہ (عِصَماً) کیا کہ وہ امن وامان سے وہاں تجارت کریں۔سنتِ ہاشمی سے تحریک پاکر ان کے برادر عبدشمس نے ملوک حبشہ سے اسی طرح کے تجارتی تحفظ حاصل کیے کہ ان کے علاقے میں ان کی تجارت تھی اور قریش کے لیے ایسے تحفظ وحفاظت کے معاہدے نوفل بن عبدمناف نے ملوک عراق سے حاصل کیے اور اس طرح وہ موسم سرما میں یمن ، حبشہ اور عراق اور موسم گرما میں شام کو جایا کرتے تھے۔ دونوں تجارتی سفروں کا یہ بیان بلاذری کا ہے ۔بعض دوسرے مآخذ نے بھی قریب قریب اسی معنیٰ ومفہوم کی روایت بیان کی ہے۔ان میں سے بعض میں یہ اضافہ ہے کہ جناب ہاشم کے دوسرے بھائی اوران کے جانشین اور اتالیقِ اولاد جناب مطلب بن عبدمناف نے ایران کے حکم رانوں (ملوک) سے قریشی تجارت کی حفاظت کے معاہدے کیے تھے۔۷؎ اس طرح ان روایات کے مطابق عبدمناف کے چاروں قابل ذکر فرزندوں نے جزیرہ نمائے عرب کی چاروں سمتوں میں واقع ملکوں سے معاہدے قائم کیے۔ان روایات میں مبالغہ کا عنصر نظر آتا ہے کہ تجارتی اسفارِ سرما وگرما کا سارا شرف اوران کی حفاظت وترقی کا تمام تر صلہ اجدادنبوی کو دے دیا گیا۔ یہ ممکن ہے اور غالباً قابلِ ترجیح بھی کہ ان چاروں اشرافِ قریش نے اپنے اپنے زمانے میں اپنے میادینِ تجارت کے حکم رانوں اور تاجروں سے تجدیدِ معاہدات کی تھی یا سابقہ تجارتی سرگرمیوں کو ترقی اور فروغ دیا تھا، ورنہ وہ تمام قبائل وبطونِ قریش کے سفیر ونمائندے یا شیوخ نہ تھے۔ یہ حفاظتی معاہدے ان کے اجدادِ پیش رو سے استوار چلے آرہے تھے اور ان کے معاصر قریشی سادات میں بہت سے ان کے ہم پلہ تاجر اور کاروباری تھے۔ انھوں نے مختلف مراکزِ تجارت کے تاجروں سے اوران سے زیادہ ان کے حاکموں سے معاہدے کیے تھے اور ان کے سبب مراعات حاصل کی تھیں۔ابن اسحاق نے بنو اسماعیل اور بنونابت کے ایک جد امجد مضاض بن عمرو اور ان کے جرہم کے ننہالی عزیزوں (اخوالھم من جرھم) کے تجارتی کاروبار اور یمنی کاروانوں اور تاجروں سے ان کے تجارتی مال پر ٹیکس لینے کا ذکر کیا ہے اوران کے درمیان صلح کے معاہدے کا بھی حوالہ دیا

ہے۔ قدیم جاہلی عرب میں عراق کے مشہور بادشاہ نعمان بن منذر کے بعض ساداتِ قریش سے تجارتی معاہدے تھے اور قریشی اکابر کے عراقی شاہ سے تھے۔ ایسے قدیم و معاصر معاہدات و تحفظاتِ تجارت کا ذکر آگے متعدد اکابر قریش اور ان کے مختلف الجہات تجارتی کاموں کے ضمن میں آئے گا۔ ۸؎

تجارتی شراکت کے معاہدے

تجارتی شراکت دار ندیم کہلاتے تھے۔ وہ بالعموم خاندانی رشتہ دار بھی ہوتے تھے اور تجارت و کاروبار کے باعث ایک دوسرے کے دوست بھی بن جاتے تھے۔ مصادرِ سیرت و تاریخ میں ان کے حوالے خال خال ملتے ہیں۔ اس کی ایک ظاہری وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ ان کے مؤلفوں کی نگاہ واقعات واحوال پر مرکوز رہی تھی۔ محمد بن حبیب بغدادی (م ۲۴۵ھ/ ۸۵۹ئ) نے سماجی اور تہذیبی پس منظر میں جاہلی اور اسلامی ادوار کے بارے میں بعض فہرستیں اپنی دونوں کتابوں میں دی ہیں۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ عہدِ نبوی کے قریب کے زمانے میں قریشِ مکہ کے کم از کم اٹھاون اکابر و شیوخ ایک دوسرے کے ندیم تھے۔ بغدادی نے ان کو شریک (شریکاً فی التجارۃ) بھی کہا ہے۔ وہ فہرست عبدالمطلب ہاشمی کے زمانے سے شروع ہوتی ہے اور عہدِ نبوی مکی کے آغاز پر تمام ہوجاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسے ندیموں کی تعداد قریش کے عظیم ترین قبیلۂ عرب میں اس سے کہیں زیادہ تھی اور اس کا تعلق قدیم زمانے سے نبوی دورِ سعید تک برابر رہا تھا۔ بغدادی نے عبدالمطلب بن ہاشم کو حرب بن امیہ اموی کا ندیم بتایا ہے کہ دونوں شراکت میں تجارت کرتے تھے۔ بنو ہاشم اور بنوامیہ کے ان دونوں عظیم ترین سرداروں کا تجارتی اشتراک اہم جہات کا حامل تھا۔ دونوں بزرگ تر خاندانِ بنو عبدمناف کے اہم ترین شیوخ ہونے کے علاوہ ایک دوسرے سے ازدواجی رشتے بھی رکھتے تھے۔ دونوں قریشی ملأ /مجلس یا اشرافیہ کے اہم ترین مناصب پر بھی فائز تھے۔ دولت و اموال، جاہ وحشمت اور دیگر وجوہ سے ایک دوسرے کے ہم پلہ تھے۔ ۹؎ ایک

اہم ارتقا یہ نظر آتا ہے کہ ایک تجارتی مناقشے کے باعث ہی عبدالمطلب ہاشمی نے قدیم ندیم سے رشتۂ شراکت ختم کرکے قریشِ مکہ کے ایک اور عظیم ترین سردار عبداللہ بن جُدعان تیمی سے شراکتِ تجارت اور ندیمی کا رشتہ و معاہدہ استوار کرلیا تھا۔بعض دوسرے ندیموں کے باب میں بھی تجارتی شراکت کی تبدیلی نظر آتی ہے۔۱۰؎

تمام ندمائ/شرکاءِ تجارت پر یہاں بحث کی ضرورت نہیں ہے،صرف چند اور مثالوں سے اس تجارتی نظام کی کارکردگی کو اجاگر کیا جاتا ہے۔عبدالمطلب ہاشمی اور حرب بن امیہ اموی کے دو فرزندوں عباس بن عبدالمطلب اور ابوسفیان بن حرب نے ایک دوسرے سے ندیمی وتجارتی شراکت کا معاہدہ کیا اور اسے مکی عہدِ نبوی ہی میں نہیں بلکہ تادمِ آخر نبھایا۔ان دونوں کے وہی تمام قربت وقرابت کے رشتے تھے جو ان کے عظیم ترین آباء واجداد کے درمیان رہے تھے۔ان دونوں کی قریب ترین رشتے داری کی وجہ سے تجارتی سرگرمیوں کا تھوڑا سا ذکر ملتا ہے۔دونوں ساتھ ساتھ اکثر وبیش تر اپنے شامی اور یمنی اسفارِ تجارت پر جاتے، ساتھ ہی تجارت و کاروبار کرتے، ایک بازار دیکھتا تو دوسرا خیمہ و مال کی نگہ داشت کرتا اور کھانا پکاتا۔ وہ دونوں ہر طرح کی مواسات میں بندھے تھے۔ خاندانِ بنوعبدمناف کے دو اور بزرگ وعظیم سرداروں ابوطالب بن عبدالمطلب ہاشمی اور مسافر بن ابی عمرو بن امیہ اموی ایسے ہی جگری دوست و ندیم تھے۔ اور ان ہی کی طرح عبدالمطلب ہاشمی کے فرزندِ اکبر حارث ہاشمی اور حرب بن امیہ اموی کے ہم نام فرزند حارث اموی بھی ایک دوسرے کے ندیم، برادر نسبتی،دوست اور شریک تھے۔اموی شریک تجارت کی موت کے بعد ہی حارث ہاشمی نے ایک دوسرے شیخ وتاجر قریش عوام بن خویلد اسدی سے دوستی اور ندیمی کا رشتہ استوار کیا تھا۔موخرالذکر مشہور و عظیم صحابی حضرت زبیر بن عوام اسدیؓ کے والد ماجد تھے اور صحابی جلیل خود بھی مکی عہد میں ایک ابھرتے ہوئے تاجر تھے اور بعد میں عظیم ترین بنے۔عظیم ترین صحابہ میں ایک حضرت عثمان بن عفان امویؓ مذکورہ حارث ہاشمی کے فرزند ربیعہ بن حارث ہاشمی کے عہد جاہلی سے اپنی خلافت تک شریکِ تجارت اور ندیم و دوست تھے۔مکی عہد کے قریب

اور دوران متعدد دوسرے قریشی جاہلی اکابر اور جلیل القدر صحابہ کرام کے تجارتی شراکت، ندیمی اور دوستی وقرابت کے تعلقات کا پتہ چلتا ہے۔۱۱؎ بعثت کے قبل کے زمانے میں تجارتی زندگی میں بہ نفس نفیس رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مختلف تاجروں سے ندیمی و شراکتِ تجارت کا رشتہ و معاہدہ قائم کیا اور نبھایا تھا۔ آپ کے متعدد شرکاء تجارت کا ذکر کیا جاتا ہے، لیکن ان کے بارے میں خاصا ابہام پایا جاتا ہے۔ سیرت نگاروں نے عام طور سے اس طرف زیادہ توجہ نہیں دی۔ ۱۲؎

ان تمام روایات و آثار سے معلوم ہوتا ہے کہ عہد جاہلی اور مکی دورِ نبوی میں تجارتی ندیمی اور شراکت کے معاہدے دو افراد میں ہوتے رہے تھے۔ وہ زبانی بھی ہوتے تھے اور تحریری بھی۔ ان کا اعلان خانہ کعبہ کے پاس مسجد حرام کے ضمن میں قریشی اکابر کی مجالس (اندیة) کے روبرو کیا جاتا تھا، تاکہ سند رہے۔ یہ قریشِ مکہ کی سماجی اور دینی روایت بھی تھی اور دوسرے شیوخ و اکابر عرب بھی اس کی پیروی کرتے اور اکابرِ قریش کا عندیہ لیتے اور توثیق بھی حاصل کرتے۔ ۱۳؎ ندیمی اور تجارتی شراکت کے ان معاہدوں کی چند اہم ترین جہات کو بشکل نکات ذیل میں پیش کیا جاتا ہے:

- بالعموم شراکتِ تجارت اور ندیمی کے فریقین تا زندگی ایک دوسرے سے وابستہ رہتے تھے۔
- اکثر وبیش تر دونوں شریک و ندیم دو مختلف خاندانوں کے ہوتے تھے۔ کبھی کبھی ایک ہی خاندان کے بھی ہوتے تھے۔
- کسی تجارتی / سماجی وجہ سے ان میں اختلاف ہوتا جو سلجھایا نہ جاسکتا تو فریقین الگ ہوجاتے اور دوسرے تاجروں سے معاہدہ کرلیتے۔
- یہ ذاتی معاہدے ہوتے تھے۔ اسی وجہ سے اگر کسی بزرگِ خاندان نے کسی دوسرے خاندان کے ندیم سے معاہدہ ختم کیا تو دوسروں پر اس کا اثر نہ پڑتا۔ جیسے عبدالمطلب ہاشمی کے حرب اموی سے الگ ہونے کے بعد ان کے فرزندوں نے اپنے تجارتی معاہدے اور رشتے برقرار رکھے تھے۔ خود دونوں

اکابر عبدمناف کے دوسرے سماجی، ازدواجی روابط اس ترکِ تجارت سے متاثر نہ ہوئے تھے۔ دونوں تادمِ آخر عزیز قریب رہے۔

- عہد جاہلی کے تجارتی شراکت اور ندیمی کے رشتے اور معاہدے ایک صحت مند روایت تھی اور وہ مکی نبوی دور میں بھی جاری رہی۔
- بسا اوقات ندیمی وشراکت تجارت کے رشتے اور معاہدے موروثی بن جاتے تھے اور باپ سے فرزند کو ملتے تھے۔
- تجارتی شراکت کے تعلقات بالعموم رشتہ داری اور مصاہرت کے روابط بھی بناتے تھے اور اکثر وبیش تر خونی رشتے ان کو استحکام بخشتے۔
- ندمائ/شرکاءِ تجارت کی دو فریقوں سے وابستگی اور معاہدہ سازی دوسرے ندماء وشرکاء سے معاہدہ کرنے سے نہیں روکتی تھی۔ ۱۴؎

متعدد شرکاءِ تجارت سے وابستگی

اس باب میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے متعدد شرکاء تجارت کی روایات سب سے اہم ہیں۔ ان کے مطابق آپؐ نے کئی قریشی اور بدوی تاجروں سے اشتراک کیا تھا۔ ان میں سے ایک قیس بن سائب مخزومیؓ تھے، جو قریش کے بڑے خاندان بنومخزوم کے ایک تاجر تھے۔ ان کے علاوہ قیس بن ابی سائب مخزومیؓ یا سائب بن ابی السائب مخزومیؓ کا بھی ذکر ملتا ہے کہ وہ آپ کے دو یا دوسرے مخزومی شریک تجارت تھے۔ حضرت سائب مخزومیؓ کے والد کا نام عبداللہ بیان کیا گیا ہے۔ عام طور پر ان مخزومی شریک تجارت کو ایک ہی فرد سمجھا گیا ہے، جن کے نام پر اختلاف ہے۔ ابوداؤد کی ایک اور روایت کے مطابق آپ کے ایک اور شریک تجارت عبداللہ بن ابی الحمصاء تھے، جن کے بدوی ہونے کا ذکر تو ملتا ہے، مگر تفصیل نہیں ملتی۔ ۱۵؎ کتبِ سیرت میں بالعموم ان سے صرف ایک معاملۂ تجارت کا ذکر کیا جاتا ہے۔ ان کے شریکِ تجارت ہونے کی تصریح نہیں کی جاتی۔ یہ باب بھی تحقیق طلب ہے۔ بغدادی کی فہرستِ ندماء/ شرکاء میں

بعض تجارِ قریش کے ایک سے زیادہ شرکاء تجارت کا حوالہ آتا ہے۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ وہ بہ یک وقت شریک وندیم ہوتے تھے یا یکے بعد دیگے مختلف زمانوں میں، جیسا کہ بعض ندماء کی موت کے بعد یا رشتۂ شراکت ختم کرنے کے بعد دوسرے تاجر سے معاہدہ کیا گیا تھا۔ مثلاً ابوطالب ہاشمی نے مسافر اموی کی ناگہانی وفات کے بعد عمرو بن عبد ودّ عامری قریشی سے ندیمی وشراکت کا تعلق استوار کرلیا تھا، جو ایک بڑا دشمن اسلام تھا۔ تمام بطون قریش سے ایک دوسرے کے تجارتی شراکت کے معاہدے تھے۔ ان میں کچھ دلچسپ خاندانوں کے اہم ترین جوڑے تھے، جیسے:

۱۔ ابولہب ہاشمی نے حارث بن عامر نوفلی سے معاہدہ کیا تھا۔

۲۔ حضرت حمزہ بن عبدالمطلب ہاشمیؓ عبداللہ بن سائب مخزومی کے شریکِ تجارت تھے۔ وہ یا ان کے والد رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے شریک تھے۔

۳۔ زبیر بن عبدالمطلب ہاشمیؓ کا رشتۂ شراکت مالک بن عمیلہ عبدری سے تھا۔

۴۔ ابوسفیان بن حارث بن عبدالمطلب ہاشمی مشہور سردار و سیاست داں حضرت عمرو بن العاص سہمیؓ کے شریک وندیم تھے، جو بعد میں مسلمان ہو گئے تھے۔

ان تمام تجارتی جوڑوں میں ایک اہم قبائلی شراکت و معاہدہ بنو مخزوم اور بنو عبدمناف کے اکابر وشیوخ کے درمیان نظر آتا ہے، جب کہ وہ دونوں سماجی اور قبائلی طور سے ایک دوسرے کے بعض معاملات میں حریف تھے۔ تجارتی حلف ومعاہدہ اس پر بھاری تھا کہ وہ ان کی معاشی خوش حالی کا ضامن تھا۔

دوسرے شہروں کے شرکاءِ تجارت

قریشِ مکہ کے اکابر کی ملک گیر اور بین الاقوامی تجارت کی واقعیت بتاتی ہے کہ بڑے تاجرانِ قریش کے شرکاء تجارت بعض دوسرے شہروں سے بھی تعلق رکھتے تھے۔ یہ فطری بھی تھا، کیوں کہ قریش مختلف اسواقِ عرب میں تجارت ملکی کے لیے جایا کرتے تھے اور شامی ویمنی تجارتی اسفار تو ان کی تجارت ومعیشت کی ریڑھ کی ہڈی

تھے۔ ان میں دوسرے قبائلی کاروانوں اور شہری کاروانوں کے ساتھ اشتراک منطقی تھا۔ قریشِ مکہ کے خاص تجارتی تعلقات قریب کے شہر طائف اور اس کے ارد گرد آباد قبیلہ ہوازن بالخصوص اس کے عظیم خاندان ثقیف سے بہت قریبی تھے۔ شامی تجارت کے راستہ پر واقع یثرب/ مدینہ بھی ان کی ایک بڑی منڈی تھی اور مرکزِ تجارت بھی۔ ان سے بھی تجارتی تعلقات بہت وسیع تھے۔ ان دونوں شہروں کے تجار اور اکابر نہ صرف ایک دوسرے کے دیار میں آتے جاتے رہتے تھے، بلکہ ان کا مکہ مکرمہ آنا خاص دینی وجوہ سے لگا رہتا تھا۔ تجارتی تعلقات نے ان شہروں، خاص کر مکہ وطائف کے تاجروں کو ایک طرف اور مکہ و یثرب/ مدینہ کے تاجروں کو دوسری طرف ایک دوسرے سے باندھ دیا تھا اوران کے سبب وہ ایک دوسرے سے تجارتی شراکت اور ندیمی کے معاہدے میں بندھے تھے اور ساتھ ہی دوسرے سماجی روابط سے بھی بندھ گئے تھے۔۱۶؎

قریشِ مکہ اور ثقیفِ طائف کی دو عظیم شخصیات ابوسفیان بن حرب اموی اور امیہ بن ابی ا لصلت ثقفی کا تعلق اسی دور سے تھا۔ وہ دونوں ایک دوسرے کے دوست، عزیز اور قریب ہونے کے علاوہ شریکِ تجارت اور ندیم رہے تھے۔ دونوں نے مدتوں ساتھ ساتھ شام و یمن کے اسفار کیے تھے۔ وہ مختلف اسواقِ عرب میں بھی ساتھ ساتھ جاتے رہتے تھے اور رفاقت میں تجارت و کاروبار کرتے تھے۔ ان کے متعدد تجارتی سفروں کا ذکر ملتا ہے اور ان سے کافی تجارتی، تمدنی، تہذیبی اور سماجی معلومات بھی ملتی ہیں۔ دونوں شرکائے تجارت ایک دوسرے کے شہروں میں جاتے تو اپنے ندیم کے گھر میں ہی مہمان رہتے۔۱۷؎

تاجرانِ حرمین کے تجارتی معاہدے

شیوخِ قریشِ مکہ اور عرب اکابرِ یثرب کے تجارتی تعلقات کا باب وسیع ہونے کے باوجود ابھی تک خاصا مبہم ہے اور تحقیق طلب بھی۔ بہرحال ایک نمائندہ مثال خزرج کے سردار حضرت سعد بن عبادہ/ بنوساعدہ کی ملتی ہے کہ انھوں نے قریش کے دو بڑے

تاجروں اور شیوخ سے باہمی تجارت کی حفاظت وصیانت کے معاہدے کر رکھے تھے اور وہ معاہدے ان کو شخصی جوار و تحفظ بھی فراہم کرتے تھے، جیسا کہ عرب کا قاعدہ تھا۔ وہ دراصل ایک دوسرے کے تجارتی معاملات کی حفاظت کے دوطرفہ معاہدے تھے۔ یثربی فریق قریشی تاجروں اور شریکوں کو ہر طرح کا تحفظ اپنے علاقے میں فراہم کریں گے اور قریشی مکی فریق اپنے یثربی شریکوں کی تجارت، اموال اور جان کا تحفظ اپنے شہر وعلاقہ میں کریں گے اور دست برد سے بچائیں گے۔ ابن اسحاق نے ایک اہم اور دلچسپ روایت کافی تفصیل سے بیعت الحرب کے تناظر میں بیان کی ہے، جو عہد نبوی مکی کے بالکل اواخر کا معاملہ ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ حضرت سعد بن عبادہ خزرجیؓ کو بعض شر پسند عناصرِ قریش نے بیعت کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لیے قید کرلیا۔ انھوں نے ایک قریشی سردار سہیل بن عمرو عامری کے مشورہ و مدد سے اپنے دو قریشی شریکوں اور معاہدوں کے نام کی دہائی دی اور اس کی خبر عامری سردار نے ان کو مسجد حرام کی مجلس میں آ کر دی۔ ان میں سے ایک بنو نوفل کے سردار تاجر جبیر بن مطعم بن عدیؓ تھے اور دوسرے حارث بن حرب بن امیہ اموی۔ دونوں ہی خاندانِ بنوعبدمناف کے شیوخ اور تاجر تھے۔ ان دونوں نے اپنے جوارِ تجارت اور معاہدۂ تحفظ کا اعتراف کیا اور حضرت سعد بن عبادہؓ کو ظالموں کے چنگل سے چھڑایا۔ ابن اسحاق نے ان کی تجارت کی حفاظت کے لیے 'جوار' کی اصطلاح استعمال کر کے تفصیل دی ہے۔ دینی لحاظ سے یہ ایک اہم ترین جہت ہے کہ قریش کے دونوں حلیفوں/ معاہدوں نے اور ان کو خبر دینے والے عامری سردار نے اختلافِ دین کے باوجود ایک مسلم تاجرِ یثرب کی مدد کی تھی اور معاہدہ کا پاس کیا تھا۔ اس وقت تک وہ تینوں قریشی اکابر اسلام نہیں لائے تھے اور کافر تھے۔۱۸؎ دونوں دیرینہ دوست و ندیم ایک دوسرے کے شہر جاتے تو اختلافِ دین کے باوجود ایک دوسرے کے گھروں میں مہمان بنتے اور قیام وتحفظ کی تمام سہولیات پاتے۔ ہجرتِ مدینہ کے بعد حضرت سعد بن معاذ اوسیؓ نے عمرہ کی خاطر مکہ مکرمہ کا سفر کیا اور اپنے کافر دوست کے گھر قیام کیا اور اسی کے جوار وتحفظ میں طواف کیا۔ قابلِ ذکر یہ نکتہ ہے کہ خانہ کعبہ کو

جاتے وقت فرعونِ امت ابوجہل مخزومی سے حضرت سعدؓ کی تلخ کلامی اور بحث ہوگئی اور امیہ جمحی نے دونوں میں صلح صفائی کرائی۔ ابوجہل مخزومی کا رویہ محض دوستانہ اس وجہ سے رہا کہ وہ امیہ بن خلف جمحی کی جوار وتحفظ کا احترام کرتا تھا۔ تمام معاہدات کی پاس داری پورے قبیلہ کی ذمہ داری بن گئی تھی۔۱۹؎ ایسے تجارتی تحفظ کے معاہدے اور بھی تھے جو مکہ و مدینہ کے تاجروں کے درمیان جاہلی عہد میں کیے گئے تھے اور جن کا پاس ولحاظ مکی دور میں بھی کیا گیا تھا اور بعد کے مدنی عہد میں بھی۔

مسلم اور کافر تاجروں کا تجارتی معاہدہ

جاہلی عہد میں کیے گئے تمام معاہداتِ جوار وتحفظ بالخصوص تجارتی معاہدوں کی ضروری روایت نے اسلامی دور میں دینی جہت بھی اختیار کر لی تھی۔ جلیل القدر صحابی حضرت عبدالرحمن بن عوف زہریؓ شیخِ مکہ امیہ بن خلف جمحی کے دوست وندیم اور شریکِ تجارت تھے اور دوسرے مراسم بھی رکھتے تھے۔ اسلام لانے کے بعد ان دونوں کے تعلقات میں سماجی یا مزاجی ترشی آئی، لیکن تعلقات باقی رہے۔ صحابی جلیل کا قدیم نام عمرو تھا، جو عرب کا ایک عام نام تھا۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسے عبدالرحمن سے بدل دیا۔ امیہ بن خلف کو وہ اتنا ناگوار ہوا کہ وہ اس نام سے دوست کو مخاطب نہیں کرتا تھا اور مسلم دوست پرانے نام سے پکارے جانے پر جواب نہ دیتے، لیکن میل ملاپ برابر جاری رہتا۔ آخر اس پر صلح ہوئی کہ صحابی مکرم کو 'عبدالالہ' سے دونوں قدیم دوست پکاریں گے اور جواب دیں گے۔ ہجرتِ مدینہ سے قبل حضرت عبدالرحمن زہریؓ نے امیہ بن خلف جمحی سے باقاعدہ ایک تحریری تجارتی معاہدہ کیا کہ وہ مدینہ منورہ میں اپنے کافر دوست کے مال وجان اور تجارت کی حفاظت کریں گے اور امیہ بن خلف جمحی مکہ میں ان کے تمام مفادات (صاغیة) کا تحفظ کرے گا۔ غزوۂ بدر کے بعد حضرت عبدالرحمن زہریؓ اور ان کے فرزند و خادم نے حسب معاہدہ اپنے کافر ومشرک دوست اور اس کے فرزند کی جان بچانے کی پوری کوشش کی اور خود زخمی بھی ہوگئے، لیکن حضرت بلال حبشیؓ اور ان

کے رفقاء کے انتقام سے ان کو نہ بچا سکے۔ حافظ ابن حجر عسقلانیؒ نے بخاری کی اس حدیث کی مختلف شروح میں وضاحت کی ہے کہ قبل ہجرت اس معاہدے کو توثیق و تصویب نبوی حاصل تھی اور وہ آپ کے علم میں تھی۔ امام بخاریؒ نے اس حدیث کو اپنی کتاب الوکالۃ کے صرف ایک باب میں نقل کر کے اور اس پر بڑی معنی خیز سرخی لگا کر اس کو دینی اور تشریعی جہات عطا کی ہیں۔ جیسے ''**باب اذا وکل المسلم حربیا فی دار الحرب -او فی دار الاسلام-جاز**''۔ اسی باب و کتاب میں یہ پوری حدیث آئی ہے۔ امام موصوف کا ایک فریق کو 'حربی' اور اس کے مقام کو دارالحرب قرار دینا دراصل بعد کی تشریعی صورت حال وارتقا کا غماز ہے، جیسا کہ دارالاسلام کا عنوان۔ کیونکہ بوقتِ معاہدہ ایک فریق کافر و مشرک تو تھا اور دوسرا مسلم و مومن، لیکن ان دونوں کے مقامات و بلاد نہ دارالحرب تھے اور نہ دارالاسلام۔ بہر حال ایسے بین القبائل اور بین البلاد معاہدوں کی کمی نہیں تھی، اگر چہ روایاتِ سیرت وحدیث میں ان کا ذکر کم آتا ہے۔ عام دفاعی معاہدوں میں بھی تجارتی ضمانتیں مضمر تھیں، مثلاً بنو عبد مناف کی طرف سے عبدالمطلب ہاشمی کا بنوخزاعہ سے معاہدہ تمام مفاداتِ باہمی کا ضامن تھا یا دیت وقصاص کے قوانین و روایات بھی ان کی ضمانت دیتے تھے۔ عام سماجی تحفظ و جوار کے شخصی ضمانت نامے بھی تجارتی سرگرمی کو محیط تھے۔ یہی وجہ ہے کہ قریشی صحیفۂ مقاطعہ میں تجارتِ بنی ہاشم و بنی مطلب پر قدغن لگا دی گئی تھی۔ ۲۰؎

خاتمۂ بحث

جاہلی عربوں بالخصوص قریشی تاجروں کی تجارت کی طرح ان کی تجارتی مفاہمت، جوار، تعاون و معاہدہ کی روایت بھی قدیم تھی۔ جزیرہ نمائے عرب کے سخت موسمی حالات، شدید جغرافیائی ظروف اور ان سے زیادہ جاں گسل اور اموال کُش قبائلی لوٹ مار جیسے اسباب نے ان کو وجود بخشا تھا۔ بین القبائلی تجارت خصوصاً اسواقِ عرب میں تجارتی کاروانوں کی شرکت کے سبب عربوں کے بدوی اور شہری دونوں قبائل سے

تجارتی مفاہمت و معاہدہ ناگزیر تھا۔ دور دراز کے اسفارِ تجارت تو درکنار، قرب و جوار کے علاقوں اور منڈیوں میں تجارت کرنے کے لیے ضروری تھا کہ خاندانی یا علاقائی کارواں بنائے جائیں۔ ان کاروانوں میں کسی ایک خاندان و بطنِ قبیلہ کے تاجر شامل ہوتے تھے اور مختلف خاندانوں کے بھی تاجروں کے ساتھ حفاظت کے لیے مسلح دستے ہوتے تھے۔۲۱؎ عرب بدوی و شہری قبیلوں کے ساتھ اور خاص کر تجارتی شاہ راہوں کے قرب و جوار میں آباد عرب قبیلوں سے تحفظ و جوار کے معاہدے کیے جاتے تھے۔ یہ معاہدے انفرادی بھی ہوتے تھے، خاندانی بھی اور قبائلی و قومی بھی۔ ان کو کرنے والے مختلف اکابرِ قبیلہ و تجارِ قوم ہوتے تھے، جن کا تعلق مختلف اکائیوں سے ہوتا تھا۔ وہ کسی زمانے میں بھی کسی ایک کبیرِ قوم، شیخِ قبیلہ اور سردارِ خاندان کے بس کی بات نہ تھی، جیسا کہ سیرت نگار جناب ہاشم کو اس کا شرفِ کلّی دیتے ہیں۔ قیصرِ روم اور قبائلِ عرب سے ان کے معاہدوں کی روایات کے ساتھ بنوعبدمناف کے تین دوسرے سرداروں کے معاہدوں کا ذکر مختلف ملکوں کے ضمن میں آتا ہے۔ روایاتِ تذکرہ ونسب و تاریخ اور روایات و آثار سیرت میں بھی دوسرے اکابرِ قریش کے معاہدوں کا خصوصی اور دوسرے اکابرِ عرب کا عمومی ذکر آتا ہے۔ یثرب کے حضرات سعدین ۔سعد بن عبادہ خزرجیؓ اور سعد بن معاذ اوسیؓ ۔ نے اکابرِ مکہ میں سے متعدد شیوخ و تجار سے جوار و تحفظ کے معاہدے کیے تھے۔۲۲؎

تجارتی مفاہمت اور کاروباری سہولت کی خاطر قریشِ مکہ اور دوسرے قبائلِ عرب کے تاجروں نے تجارتی شراکت و ندیمی کی طرح ڈالی۔ اکثر و بیش تر دو مختلف خاندانوں یا گروپوں کے دو دو تاجر ایک دوسرے کے شریک تجارت بن جاتے تھے اور ساتھ ساتھ مل کر تجارت کیا کرتے تھے۔ ایک خاندان کے متعدد افراد و تجار ایک تجارتی کمپنی بنا لیتے تھے اور دوسرے گروپ کے ساتھ تجارتی کاروبار کرتے تھے، جیسا کہ سودی کاروبار میں مکہ کے خاندان بنومغیرہ کا معاملہ تھا۔ ۲۳؎ بالعموم یہ زندگی بھر کی مفاہمت اور معاہدہ ہوتا تھا۔ ایک ندیم و شریک کی موت کے بعد ہی کسی دوسرے شریکِ تجارت و ندیم

کا انتخاب کیا جاتا تھا۔ جیسا کہ ابوطالب ہاشمی اور مسافر اموی اور حارث بن حرب اموی اور حارث بن عبدالمطلب ہاشمی کے معاملاتِ شرکت وندیمی میں نظر آتا ہے۔ بعض حالات میں خاص کر ندیمی وتجارتی مفاہمت کی خلاف ورزی یا کسی جوارِ تجارت وتحفظ ذاتی کی شکست وخلاف ورزی بھی وجہِ مخالفت بن جاتی تھی۔ جیسا کہ عبدالمطلب ہاشمی اور حرب بن امیہ اموی کے معاملہ میں موخر الذکر کے تجاوز کی بنا پر ہوا تھا۔ یہ تمام استثنائی معاملات تھے۔ تجارتی مفاہمت و معاہدۂ طرفین ۔ شراکت وندیمی۔ بالعموم دو انفرادی تاجروں کا انتخاب ہوتا تھا اور وہ موروثی نہیں بنا کرتا تھا۔ شیخِ خاندان اور کبیرِ قوم کے معاہدۂ تجارت و جوار کے بالکل متوازی اور الگ اس کے تاجر فرزندوں اور عزیزوں کے معاہدات ہوتے تھے۔ شیخِ بنی ہاشم عبدالمطلب ہاشمی کی حیات ہی میں ان کے کم از کم چار فرزندوں: ابوطالب، زبیر، ابولہب اور حارث نے دوسروں سے شراکت کی تھی۔ ان کی وفات کے بعد ان کے دو فرزندوں حضرات عباس وحمزہ رضی اللہ عنہما نے اپنے شریکِ تجارت منتخب کیے تھے، جن میں سے اول الذکر کے اموی اور موخر الذکر کے مخزومی تھے۔ حضرت عباس ہاشمیؓ کی ابوسفیان بن حرب امویؓ سے شراکت و منادمت موروثی نہیں تھی، بلکہ ان دونوں کی تجارتی قربت اور خونی قرابت کی وجہ سے تھی۔ لیکن کبھی کبھی باپ کا شریکِ تجارت و دوست فرزند کا ندیم اس کی وفات کے بعد بن جاتا تھا، جیسے ہاشم نے اپنے باپ کے یثربی ندیم سے اور زبیر نے اپنے باپ عبدالمطلب کے ندیم عبداللہ بن جدعان تیمی سے شراکت کر لی تھی۔ ۲۴ ۔ خاندانِ بنی ہاشم کے متعدد افراد وتجار کی شراکت و دوستی اور منادمت و معاہدہ بنوامیہ کے خاندان کے ساتھ بہت معنی خیز ہے، مگر حیران کن نہیں کہ وہ دونوں خاندانِ بنوعبدمناف کے دو بڑے خاندان تھے، جیسے بنونوفل و بنومطلب دوسرے دو بڑے ارکان تھے۔ قبائلی یا خاندانی مسابقت اور کسی معنی میں عصبیت کے باوجود محض تجارتی مصالح سے حریف سمجھے جانے والے خاندان کے افراد وتجار سے بھی شراکت کی جاتی تھی ۔ بنوعبدمناف کے متعدد تاجروں نے مخزومی اکابرِ تجار کے ساتھ شراکت و منادمت کا معاہدہ کیا تھا اور ان میں دشمنِ اسلام ابولہب بھی شامل تھا۔ رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مخزومی تاجروں سے شراکت قبلِ بعثت کے دور میں کردار و اخلاقِ نبوی کی آفاقیت کے

ساتھ تجارتی مصالح سے بھی تھی۔

بین القبائلی اور بین الاقوامی تجارتِ عرب وقریش نے نئی جولان گاہیں پیدا کردی تھیں اور شراکت ومنادمت کا حلقہ وسیع تر کردیا تھا۔قریشِ مکہ کے قریب ترین شہر طائف اوران کے قبیلہ ہوازن کی خاص شاخ ثقیف سے تجارتی شراکت ومنادمت کی صرف ایک مثال مل سکی ہے، وہ ابوسفیان اموی اورامیہ بن ابی ا لصلت ثقفی کی ہے، لیکن وہ درحقیقت تنہا جوڑی نہ تھی۔قریشی وثقفی تاجروں کی منادمت ایک عصری واقعہ تھا۔اسی طرح شامی تجارت کی گزرگاہوں اور منڈیوں، خاص کر یثرب و مدینہ کے تاجروں سے بھی ان کی شراکت و منادمت بالکل امکانی ہے۔ دراصل اس تجارتی شراکت وندیمی کی ایک سماجی وتہذیبی جہت بھی تھی۔تجارت وکاروبار ان کے فریقوں کو دوستی و قربت کے رشتوں میں باندھتا اور وہ بسا اوقات دونوں فریقوں کے درمیان ازدواجی تعلقات کا باعث بن جاتا، جیسا کہ عبدمناف بن قصی اور ان کے فرزند ہاشم کا معاملہ یثرب کے قبیلہ خزرج کے خاندان بنوعدی بن النجار کے شیخ زید بن عمرو کے ساتھ ہوا۔اسی رشتہ داری نے ابن الاخت (بہن کے فرزند) کا تقدس اور تعلق خاطر نہ صرف اولاد ہاشم کو بخشا، بلکہ وہ نسل عبدالمطلبی کو عطا کرگیا اور عرب روایت کے مطابق ابن الاخت ان کی قوم میں مل گیا۔بنوالنجار نے حضرات عباس بن عبدالمطلب ہاشمی اور ان کے بھتیجے عقیل بن ابی طالب ہاشمی کی غزوہ بدر میں اسیری کے موقعہ پر اس قرابت کا واسطہ دیا تھا اور وہ ہمیشہ اس کا لحاظ کرتے تھے۔رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بنوعدی بن النجار بلکہ پورے بطن بنوالنجار سے ننہالی رشتہ داری اسی وجہ سے تھی اور آپ نے اس کی ہمیشہ رعایت بھی کی تھی۔ہجرت مدینہ کے بعد ایک نجاری میزبان حضرت ابوایوب انصاریؓ کے گھر میں قیام اور ان کے نقیب النقباء کی وفات کے بعد آپ کی اس عہدہ پر سرفرازی اسی قرابت کی وجہ سے تھی۔ سماجی اور تجارتی مفاہمت وقرابت میں یک طرفہ معاملہ نہیں ہوتا، وہ دوطرفہ بلکہ خاصا پیچیدہ اور وسیع ترین جہات و اثرات کا حامل ہوتا ہے۔ اپنے وقت کے دو عظیم ترین احناف حضرات زید بن عمرو بن نفیل عدوی اور ورقہ بن نوفل

اسدی کی شراکت وندیمی ان کی دینی وفکری اور مزاجی ہم آہنگی کا عنصر پیش کرتی ہے۔ خونی رشتہ داری، ازدواجی قرابت، شہری ومحلی قربت، مزاجی ہم آہنگی، معاشرتی مساوات، دولت و مال کی ہم مرتبی اور منصب داری اور مشیخت وغیرہ کی برابری بھی تجارتی شراکت، منادمت اور مفاہمت و معاہدہ کی بنا ڈالتی تھیں اور متعدد افراد ان ہی وجوہ سے ندیم بنے تھے۔ عتبہ بن ربیعہ عبشمی اور مطعم بن عدی نوفلی، عاص بن وائل سہمی اور ہشام بن مغیرہ مخزومی، ابوجہل عمرو بن ہشام مخزومی اور حکم بن ابی العاص اموی وغیرہ کی شراکت وندیمی اسی ہم مرتبت کی غماز ہے۔ بالعموم سیاسی وسماجی اور قبائلی معاملات میں خاندان بنوعبدمناف کے چاروں بطون کو دوفریق گروہوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ بنو ہاشم و بنومطلب ایک متحدہ اکائی کی طرح کام کرتے تھے اور بنونوفل و بنوامیہ/عبدشمس ایک دوسرا گروپ بناتے تھے۔ لیکن تجارتی مصالح نے ان سب کو شیر وشکر کردیا تھا۔ جب بھی متحدہ خاندانِ بنوعبدمناف کا معاملہ کسی دوسرے بطن و خاندانِ قریش سے پڑا، چاروں متحد ہوگئے اور حریفوں نے مشکل میں دست گیری کی۔ عتبہ بن ربیعہ عبشمی اور ان کے شریک وندیم مطعم بن عدی نوفلی کا یہی وطیرہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے معاملہ میں رہا تھا اور موخرالذکر ہی نے آپ کو ذاتی جواردی تھی۔ ۲۶؎

مکی عہد نے جاہلی عرب کی جو صالح وراثت پائی تھی اس میں متعدد دوسری چیزوں اور روایتوں کے علاوہ تجارتی روایات بھی تھیں۔ بعثت سے قبل کے زمانے میں رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ کے بزرگ صحابہ نے شراکتِ تجارت اور ندیمی کی مفاہمت ومعاہدت کی دولت پائی۔ اگرچہ بیش تر صحابہ کرام کے بارے میں روایات خاموش ہیں اور فہرستِ بغدادی صرف جاہلی دور کے ندیموں اور شریکوں کا ہی احاطہ کرتی ہے۔ بہرحال ان میں حضرت حمزہ ہاشمی اور عبداللہ بن سائب مخزومی، حضرت عباس ہاشمی اور حضرت ابوسفیان اموی اور حضرت حارث ہاشمی اور عمرو بن عاص سہمی اور ان سے زیادہ حضرات عثمان بن عفان اموی اور ربیعہ بن حارث ہاشمی کی شراکت وندیمی اہم ترین واقعات ہیں اور موخرالذکر تو حضرت عثمان کی خلافت تک ان کے شریک رہے۔ اگرچہ وہ

بعد میں اسلام لائے تھے اور حضرت عثمان کی ہجرتِ مدینہ کے بعد ان سے رشتۂ شراکت ٹوٹ گیا تھا، لیکن بعد میں وہ حسبِ سابق دونوں میں استوار ہوگیا تھا۔ بین القبائلی اور بین البلادی شراکت وتجارتی تحفظ قریش مکہ کے ابوسفیان اموی اور ثقیف کے امیہ بن ابی ا لصلت ثقفی کے درمیان ایک مثال ہے۔ اسدالغابۃ کے مطابق شیخِ مکہ حرب بن امیہ اموی اور شیخ بنوسلیم مرداس بن ابی عامر سلمی شریکِ تجارت اور دوست تھے۔ ایسے متعدد بدوی قبائل وشیوخ نے ندیمی اختیار کی تھی جس طرح حضرت سعد بن عبادہ خزرجی کا معاہدۂ جوار دو قریشی اکابر حارث اموی اور جبیر بن مطعم نوفلی سے تھا اور اختلافِ دین نے اسے نہیں منسوخ کیا تھا۔ اسی ماخذ کے مطابق ایک نادر و اہم روایتِ ندیمی یہ ملتی ہے کہ جناب عبداللہ بن عبدالمطلب ہاشمی بنوسلیم کے معاصرِ نبوی سردار عباس بن انس سلمی کے شریک وندیم تھے۔ ۲۷؎

بعثتِ نبوی کے بعد ان تمام معاہداتِ شراکت و ندیمی اور معاہداتِ تحفظ و جوار کو رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تصدیق وتقریر کی سند مل گئی۔ اس نے مکی دور کے ان تمام جاہلی صالح تجارتی اقدامات ومعاملات کو اسلامی شریعت کی تائید فراہم کردی اور یہ خاص مکی تشریعی ارتقاء تھا۔ اجازتِ نبوی اور تقریرِ سنت کی بنا پر ہی ایک قدیم ترین مسلم تاجر حضرت عبدالرحمن زہریؓ نے مکی عہد کے اواخر میں ایک دشمنِ اسلام مگر اپنے تجارتی شریک وقدیم دوست امیہ بن خلف جمحی سے باقاعدہ ایک تحریری معاہدۂ جوار وتحفظ کیا تھا، جس پر فریقین نے بعد ہجرتِ مدینہ بھی عمل کیا، جیسے دوسرے اکابرِ مدینہ نے اپنے مکی رفیق وصدیق اور شریک وندیم کے ساتھ معاملہ کیا تھا۔ اسلامی شریعت کی اسی امدادِ باہمی کی حکمتِ عملی نے ایک مسلم و ایک کافر کے درمیان تجارتی اور سماجی جوار کو زندگی بخشی تو رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا خالص تعاون علی الخیر اور امدادِ باہمی کا جذبہ تھا جس نے حلف الفضول ۲۸؎ میں شرکت کرنے اور اس کا نفاذ کرنے کا یارا بخشا تھا۔ آپؐ نے اسی کے دفعات کے زیر اثر مکی دور میں کئی بیرونی تاجروں کو بعض بڑے بڑے اکابرِ قریش سے ان کے حقوق دلوائے تھے، کیونکہ وہ بے چارے آفاقی تاجر تھے اور تجارتی تحفظ و جوار

کے دفاعی ہتھیار سے محروم تھے، حالانکہ وہ بھی قریشی اکابر کے ہم مذہب اور اسلام سے ناآشنا تھے۔ حلف الفضول کی اسی اجتماعی صالحیت اور خیرِ کل اور امدادِ بیکراں کے پہلو کے سبب آپؐ اسلامی نظام کے قیام کے بعد بھی اس جیسے معاہدہ میں شرکت کے لیے تیار رہتے تھے۔۲۹ نبوی مکی اسوہ، اسلامی شریعت اور دین حنیفی کی صالح روایات نے مل کر تحفظ و جوار کا ایک انسانی نظامِ تحفظ برپا کیا تھا۔ تجارتی جوار و تحفظ اور معاہدہ کی روایت اس خیرِ کل کے صرف ایک پہلو کی نمائندگی کرتی ہے۔

حواشی و مراجع

۱۔ سورۂ ایلاف:۱-۲، ملاحظہ کیجیے کتب تفسیر بالخصوص طبری کی تفسیر اور ابن کثیر کی تفسیر میں ان کی تفسیری روایات۔

۲۔ ابن اسحاق/ ابن ہشام، (السیرۃ النبویۃ، مکتبۃ المورد، قاہرہ ۲۰۰۶ئ)؛ بلاذری، (انساب الاشراف، تحقیق یوسف مرعشلی، بیروت ۲۰۰۸ئ، ص۹۱ و مابعد؛ تحقیق ڈاکٹر محمد حمیداللہ، قاہرہ ۱۹۵۹ئ)؛ ابن سعد، (الطبقات الکبریٰ) وغیرہ نے نسبِ عرب بالخصوص نسبِ نبوی اور بعد میں سیرت نبوی کے حوالے سے جاہلی عربوں کی تجارتی سرگرمیوں کا جائزہ لیا ہے۔ جدید سیرت نگاروں نے ان ہی کا طریق روایت قبول کیا ہے اور تجزیاتی اور موضوعاتی بحث و مباحثے سے گریز کیا ہے۔ ملاحظہ ہو: شبلی نعمانی، سیرۃ النبی، معارف، اعظم گڑھ ۱۹۸۳ئ، ۱/ ۱۶۳-۱۶۶ و مابعد

۳۔ ملاحظہ کیجیے مذکورہ بالا م آخذ و ثانوی مطالعاتِ سیرت۔ بحث آگے آتی ہے۔

۴۔ مثلاً شبلی (۱/۱۶۵-۱۶۶) کا بیان ہے کہ ۔۔۔ تجارت کو نہایت ترقی دی، قیصر روم سے خط و کتابت کر کے فرمان لکھوایا کہ قریش جب اس کے ملک میں اسباب تجارت لے کر جائیں تو ان سے کوئی ٹیکس نہ لیا جائے۔ حبش کے بادشاہ نجاشی سے بھی اسی قسم کا فرمان حاصل کیا۔" اسی کے بعد یمن میں جاڑوں کے سفر کا اور گرمیوں میں شام اور ایشیائے کوچک تک تجارت کرنے کے لیے جانے کا ذکر کیا ہے اور طبقات ابن سعد جلد ۱، صفحہ ۴۱ کا حوالہ

حاشیہ پر دیا ہے۔اور امالی ابوعلی قالی کے عمومی حوالے سے لکھا ہے کہ ''ہاشم نے مختلف قبائل میں دورہ کر کے قبائل سے یہ معاہدہ کیا کہ قریش کے کاروان تجارت کو ضرر نہ پہنچائیں گے، جس کے صلہ میں کاروان قریش ان قبائل میں ان کی ضرورت کی چیزیں خود لے کر جائے گا اور ان سے خرید وفروخت کرے گا۔ یہ سبب تھا کہ عرب میں باوجود عام لوٹ مار کے قریش کا قافلۂ تجارت ہمیشہ محفوظ رہتا تھا''۔شبلی نے تمام قریشی تجارت کی ترقی اور حفاظت کا شرف صرف جناب ہاشم کو دے دیا ہے، حالانکہ وہ ان کی ذاتی تجارت کا معاملہ تھا۔

۵۔ ابن اسحاق، ۱/۹۵،''وکان هاشم فیما یزعمون اول من سنّ الرحلتین لقریش، رحلتی الشتاء والصیف''۔ دوسروں نے مزعومہ کو واقعہ بنایا ہے، جیسے بلاذری، ص۱۴۸: وکان هاشم بن عبد مناف صاحب ایلاف قریش الرحلتین و اول من سنّهما الخ۔ اس پر بحث آگے آتی ہے۔

۶۔ بلاذری،ص۱۶۱۔۱۶۲: کان هاشم بن عبدمناف یختلف الی الشام فی التجارة، فاذا مرّ بیثرب نزل علی عمرو بن زید بن لبید، وکان صدیقاً لابیه، ولّه، فزل فی سفرة من سفراته وقد انصرف من متجره وفرأی ابنته سلمیٰ بنت عمرو، فأعجبته۔۔۔ فخطبها فانکحه ایاها۔۔۔''

جناب ہاشم اپنی یثربی بیوی سلمیٰ کو مکہ مکرمہ لے آئے تھے اور جب ان کے وضع حمل کا زمانہ آیا تو انھیں شرط کے مطابق یثرب ان کے والد کے مکان میں چھوڑا اور خود شام کو اپنی تجارت کے لیے چلے گئے اور وہیں غزہ شہر فلسطین میں ان کا انتقال ہوا۔

۷۔ بلاذری،ص ۱۴۸۔۱۴۹، حدیث الایلاف کی سرخی کے تحت۔ یہی دوسرے مآخذ کا بھی بیان ہے۔ بلاذری نے مطلب بن عبدمناف کا ذکر نہیں کیا ہے۔

ابن اسحاق/ ابن ہشام، ۱/۴۶ میں ابن ہشام کی تفسیر ایلاف سے پتہ چلتا ہے کہ شامی تجارت کے دونوں گرمی اور سردی کے اسفار قریش ہوتے تھے، ایلاف قریش: إلفهم الخروج الی الشام فی تجارتهم، وکانت لهم خرجتان، خرجة فی الشتاء، وخرجة فی الصیف، اخبرنی أبوزید الانصاری الخ''

۸۔ ابن اسحاق/ ابن ہشام، ۱/ ۴۶، ۵۶، ۸۱ وغیرہ

۹۔ بغدادی، کتاب المنمق، حیدرآباد دکن، ۱۹۶۴ئ، ص ۲۷-۲۸، ۵۵-۴۵۹؛ کتاب المحبّر، حیدرآباد دکن، ۱۹۴۲ئ، ص ۱۷۳-۱۷۸؛ نیز ابن سعد، ۱/ ۸۷؛ بلاذری، انساب الاشراف، ۱/ ۷۲

حرب بن امیہ اموی قیادہ کے منصب دار ہونے کے سبب افواج قریش کے سالارِ اعلیٰ تھے اور حرب فجار ان ہی کی قیادت میں ہوئی تھی۔ عبدالمطلب ہاشمی رفادہ وسقایہ دونوں کے منصب دار تھے۔ اسی وجہ سے ان کو دینی وجاہت حاصل تھی کہ یہ دونوں مناصب حجاج سے متعلق تھے۔ یہ مناصب موروثی طور سے قریش کے بطون/ خاندانوں میں ایک نسل سے دوسری نسل میں منتقل ہوتے تھے۔ مزید بحث وتفصیل کے لیے ملاحظہ ہو راقم کی کتاب: نبو ہاشم اور بنوامیہ کے معاشرتی تعلقات، طبع علی گڑھ ۲۰۰۱ئ، ص ۱۱- ۲۳ ومابعد۔

۱۰۔ بلاذری (ص ۱۸۲ ومابعد) کی روایت ہے کہ عبدالمطلب ہاشمی کے جوار میں ایک کارگزار یہودی تاجر اُدینہ نامی تھا، جو اپنے اموال تجارت کے ساتھ تہامہ کے بازاروں میں کاروبار کرتا تھا۔ یہ تجارت حرب اموی کو سخت ناپسند تھی، لہٰذا اس 'جارتاجر' کو حرب اموی نے قتل کرا دیا۔ عبدالمطلب ہاشمی نے اپنے ندیم وعزیز حرب اموی سے اس کی دیت طلب کی، جس کا اس نے انکار کیا۔ نوبت منافرہ تک پہنچی اور نفیل بن عبدالعزیٰ جیسے قریشی صاحب وجاہت منصف نے حرب کے خلاف فیصلہ کر دیا اور عبدالمطلب ہاشمی نے اپنے ندیم وعزیز کی ہٹ دھرمی پر تجارتی معاہدہ منسوخ کر دیا۔

منافرہ کی روایت بھی عرب جاہلی کی ایک اہم سماجی روایت تھی، جس پر تحقیقی کام کی ضرورت ہے۔ اسی طرح شیخ عبداللہ بن جدعان تیمی پر ایک تحقیقی مطالعہ کی ضرورت ہے۔

۱۱۔ کتاب خاکسار مذکورہ بالا کے اولین دو ابواب، جن کے خاص ماخذ ہیں: کتاب المنمّق، ۴۵۶؛ کتاب المحبر، ص ۱۷۴، ۱۷۷؛ ابوالفرج اصفہانی، کتاب الاغانی، طبع لائیڈن، ۱۹۰۰ئ، ۶/ ۱۹۵؛ بلاذری، ۵/ ۳۹ (یروشلم، ۱۹۳۶ئ)

۱۲۔ شبلی (۱/ ۱۹۸) نے صرف ایک شریک تجارت قیس بن سائب مخزومی کا ذکر استیعاب واصابہ میں ان کے خاکوں کے حوالے سے کیا ہے۔ سید ابوالاعلیٰ مودودی، سیرت سرور

عالم، دہلی، ۱۹۸۹ئ، ۲/۱۱۸۔۱۱۹ بحوالہ استیعاب، مسند احمد، ابوداؤد؛ ابن اسحاق/ ابن ہشام (۲/۲۲۷) نے السائب بن ابی السائب بن عابد بن عبداللہ بن عمر بن مخزوم نسب بتایا ہے اور ابن ہشام نے ان کو 'شریک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قرار دے کر ایک حدیث نبوی نقل کی ہے: ''نعم الشریک السائب، لایشاری ولا یماری''۔ وہ بعد میں اسلام لے آئے تھے۔

۱۳۔ یہ بھی قریشی سماجی روایات میں سے ایک اہم ترین روایت تھی۔ وہ معاہدہ کے فریقوں کے اعلان کے علاوہ قریشی اکابر کی توثیق وتحفظ کی بھی ضمانت دیتی تھی۔ عہد جاہلی اور عہد مکی میں اس روایت پر خوب عمل ہوتا رہا اور مکی عہد اور تاریخ اسلام کے متعدد واقعات میں اس کا ذکر آتا ہے۔ مجالسِ قریش/ اندیہ کا ذکر قرآن وحدیث اور روایات سیرت میں کثرت سے آیا ہے۔ ان پر ایک عمدہ تحقیقی کام کیا جاسکتا ہے۔

۱۴۔ ملاحظہ کیجیے 'بنوہاشم اور بنوامیہ کے معاشرتی تعلقات' کے مذکورہ بالا ابواب اور ان کے حواشی اور مآخذ۔

۱۵۔ مودودی، ۲/۱۱۸۔۱۱۹ بحوالہ مآخذ مذکورہ۔ موخرالذکر کے لیے ملاحظہ کیجیے سنن ابی ابوداؤد، کتاب الادب، باب فی العدۃ

۱۶۔ بحث کے لیے دو مطالعاتِ خاکسار ملاحظہ ہوں: (۱) عہد نبوی میں قریش وثقیف کے تعلقات (کتاب زیر طبع) (۲) مکہ و مدینہ کے تعلقات، مقالہ، شائع شدہ در سہ ماہی تحقیقات اسلامی، علی گڑھ، جولائی۔ستمبر ۲۰۰۲ء

۱۷۔ ابن کثیر، البدایۃ والنہایۃ، طبع قاہرہ ۱۹۳۲ئ، ۲/۲۲۱۔۲۲۷ اور دیگر صفحات۔ حافظ موصوف نے زبیر بن بکّار کی نسب قریش، طبرانی، سہیلی، بیہقی وغیرہ سے متعدد روایات نقل کی ہیں، جو ان دونوں کے سماجی، ازدواجی اور تجارتی تعلقات ومعاہدات کا ذکر کرتی ہیں۔ بحث کے لیے ملاحظہ کیجیے کتابِ خاکسار 'عہد نبوی میں تجارت' (زیر طبع)

۱۸۔ ابن اسحاق/ ابن ہشام، ۲/ ۶۲ ومابعد۔ اس واقعہ میں حضرت سہیل بن عمرو عامریؓ کا کردار بہت اہم ہے۔ مکی عہد میں خاص طور سے ان کی سیرت وکردار پر ایک تحقیقی مطالعہ

کی ضرورت ہے۔

۱۹۔ بخاری/ فتح الباری، کتاب المغازی، باب ذکر النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم من یقتل ببدر، حدیث: ۳۹۵۰، ۷/۳۵۱-۳۵۵: ۔۔۔ **کان صدیقا لامیة بن خلف، و کان امیة اذا مر بالمدینة نزل علی سعد، و کان سعد اذا مر بمکة نزل علی امیة، فلما قدم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم المدینة انطلق سعد معتمرا فنزل علی امیة بمکة۔۔۔**" اس مفصل حدیث میں دونوں شیوخ مکہ و یثرب کی صداقت واخوت کا بار بار ذکر آیا ہے۔

۲۰۔ فتح الباری: ۴/ ۶۰۴-۶۰۵ و مابعد؛ ابن اسحاق/ ابن ہشام: ۲/۲۷۱-۲۷۲؛ سہیلی الروض الانف، طبع قاہرہ غیر مورخہ، ۵/ ۱۰۵-۱۱۰؛ طبری، تاریخ، قاہرہ ۱۹۶۰ئ، ۲/ ۴۵۱؛ بلاذری، ۱/ ۱۹۱۔ بحث کے لیے کتابِ خاکسار 'مکی اسوہ نبوی' دارالقلم کراچی، ۲۰۰۸ئ، ص ۱۷۸-۱۷۹۔ کتاب المغازی کے 'باب قتل ابی جہل' کے تحت یہی حدیث اپنے دوسرے طرف: ۳۹۷۱ میں بہت مختصر آئی ہے۔ فتح الباری، ۷/ ۳۷۳؛ ابن ہشام (۲/ ۲۲۸) میں ان کو قتل کرنے والوں کے دوسرے نام ہیں۔ بخاری اور فتح الباری کی بحث کو بہر حال ترجیح حاصل ہے۔ نیز ابن ہشام، ۲/ ۳-۴؛ بلاذری، ۱۷۷-۱۸۰ بالترتیب صحیفۂ مقاطعہ و حلف عبدالمطلب وخزاعہ کے لیے۔ یہ دونوں معاہدے تحریری تھے۔ ان کے متنون بھی ہیں۔ امام بخاریؒ کی طرح ان کے بیش تر معاصر اور پیش رو سیرت نگاروں اور محدثوں نے بہت سی روایات و احادیث کی تشریح و تبویب اپنے زمانے کے فنی وفقہی یا اسلامی وتشریعی اصطلاحات کے تناظر میں کی ہے۔ اس سے عہد نبوی کے معاملات وامور کی تفہیم مشکل ہوجاتی ہے۔ موخر علماء وفقہاء نے اس ارتقائی فرق کو مدنظر نہیں رکھا۔

۲۱۔ قریشی اور دوسرے عرب کاروانوں کا ذکر کثرت سے روایاتِ سیرت وتذکرہ وتاریخ میں آتا ہے۔ ان پر ایک پورا تحقیقی مقالہ لکھا جاسکتا ہے۔ جیسے شیخ بنی ہاشم عبدالمطلب ہاشمی کو 'صاحب عیرات قریش' کہا گیا ہے کہ ان کے کاروانِ تجارت مسلسل شام وغیرہ جایا کرتے تھے۔ ابن ہشام: ۱/ ۔۔۔ قریش قبیلہ کے کاروانوں کا الگ ذکر ملتا ہے۔ جناب عبداللہ بن عبدالمطلب ہاشمی قریشی کاروانوں کے ایک کارواں میں بھی شام گئے

تھے۔ابن سعد: ۱ / ۹۹،عبداللہ بن جدعان تیمی کے ایک کارواں میں دو ہزار اونٹ تھے، جن پر شام سے گیہوں، گھی اور شہد وغیرہ جیسی چیزیں لائی گئیں۔سہیلی: ۲ / ۷۶۔۷۸۔

۲۲۔ دوسرے تمام مآخذ سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ متعدد ساداتِ قریش اور شیوخ عرب نے قرب و جوار کے ملکوں اور عرب قبیلوں سے معاہدے کیے تھے۔

۲۳۔ فضل الرحمن گنوری، تجارتی سود، طبع علی گڑھ۔سودی کاروبار قریش وثقیف اور سود کی تحریم کی آیات قرآنی کی تفسیر وروایات میں اس کا حوالہ آتا ہے۔اس پر تحقیق کی اب بھی گنجائش ہے۔

۲۴۔ ابن کثیر، البدایۃ والنہایۃ: ۲ / ۲۹۲؛ سہیلی: ۲ / ۷۰۔۸۵ ومابعد

۲۵۔ فتح الباری: ۶ / ۶۷۵ ومابعد، کتاب المناقب، باب ابن اخت القوم منہم الخ؛ ابن اسحاق/ ابن ہشام (۲ / ۲۲۹) نے حضرت عباسؓ کا ذکر نہیں کیا ہے۔

۲۶۔ کتاب خاکسار 'بنو ہاشم و بنوامیہ کے معاشرتی تعلقات' کے مختلف ابواب میں بنوعبدمناف کے متحدہ خاندان ہونے کی روایات مختلف ادوار میں ملتی ہیں۔مزید ملاحظہ کیجیے مقالۂ خاکسار 'بزرگ تر خاندانِ رسالت۔بنوعبدمناف'، شائع شدہ در ماہ نامہ معارف، اعظم گڑھ؛ ابن اسحاق/ابن ہشام، ۱ / ۱۰۳: **وکان بنو عبدمناف اھل بیت واحد، شرف بعضھم لبعض شرف، وفضل بعضھم لبعض فضل۔۔۔**" نیز مابعد

۲۷۔ اسد الغابۃ، ۳ / ۱۱۲ اور ۳ / ۱۰۸ بالترتیب

۲۸۔ حلف الفضول کی تحریک رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چچا زبیر بن عبدالمطلب ہاشمی نے کی تھی اور ان کے شریک تجارت عبداللہ بن جدعان تیمی نے اس کی تصدیق کی اور دونوں نے مل کر قریش مکہ کے چند خاندانوں کے سربراہوں اور سرداروں کے ساتھ جناب تیمی کے گھر میں مظلوموں کی امداد کا معاہدہ کیا تھا۔تجارتی شراکت وندیمی کے تعلقات نے ایک سماجی معاہدہ کی بنیاد ڈالی تھی۔یہ ایک اہم واقعہ ہے جس پر اس پہلو سے غور نہیں کیا گیا۔ابن کثیر، ۲ / ۲۹۲؛ سہیلی، ۲ / ۷۰۔۸۵ ومابعد

۲۹۔ ابن اسحاق/ ابن ہشام، ۱ / ۹۳ ومابعد

☆☆☆

فتاویٰ عالم گیری۔ المسوّیٰ کا ایک بنیادی ماخذ

ڈاکٹر ضیاء الدین ملک فلاحی

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ (م ۱۱۷۶ھ/ ۱۷۶۲ئ) نے حجۃ اللہ البالغہ میں کتب احادیث کی درجہ بندی میں امام مالک (م ۱۷۹ھ/ ۷۹۵ئ) کی الموطا کو پہلا مقام عطا کیا ہے۔ اس فضیلت کے انھوں نے متعدد اسباب گنائے ہیں، مثلاً یہ کہ مؤطا کے مصنف بے مثل ہیں، اس کتاب میں صحت کا اہتمام کیا گیا ہے، جمہور اہل اسلام کے نزدیک وہ مقبول ہے، مقاصد کے استیعاب کے سلسلہ میں روئے زمین پر اس جیسی کتاب موجود نہیں ہے۔ اس کی فنی حیثیت پر تمام محدثین کا اتفاق ہے، نیز یہ کہ مؤطا پر چاروں فقہ کی اساس ہے۔ ۱؎

مؤطا کی فضیلت کا اظہار و اعتراف شاہ صاحب سے قبل بعض دیگر ائمہ دین اور معروف محدثین کو بھی رہا ہے چنانچہ امام شافعیؒ (م ۲۰۴ھ/ ۸۱۹ئ)، حافظ مغلطائی (م ۷۶۲ھ/ ۱۳۶۱ئ) اور حافظ ابن حجر عسقلانی (۸۵۲ھ/ ۱۴۴۹ئ) کے اقوال شاہ صاحب نے اپنی تائید میں پیش کیے ہیں۔ ۲؎ مؤطا دورِ تبع تابعین کا محفوظ ترین علمی سرمایہ ہے، جس نے فقہ الحدیث کی بنیادیں فراہم کی ہیں۔ چنانچہ شاہ صاحب نے امام مالک کو امام محدثین وفقہاء قرار دیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کی شخصیت کی تعمیر اور ان میں تطبیقی رجحان پیدا کرنے میں مؤطا امام مالک کا کردار بنیادی اور کلیدی ہے۔

شاہ ولی اللہؒ کی شروحِ موطا

شاہ ولی اللہؒ نے موطا کی دو شرحیں تحریر کی ہیں۔ ایک فارسی زبان میں ہے اور دوسری عربی زبان میں۔ ذیل میں ان کا مختصر تعارف کرایا جاتا ہے:

(۱) المصفّٰی

یہ مؤطا کی فارسی شرح ہے، جو دو جلدوں پر مشتمل ہے۔ اس کی تکمیل شاہ صاحب کی حیات ہی میں ہو چکی تھی، البتہ مصروفیات نے موقع نہیں دیا کہ وہ اس کی اشاعت کی طرف توجہ دے سکیں۔ ان کے شاگرد رشید مولوی محمد عاشق پھلتی نے ان کی وفات کے بعد اس کی تکمیل و تدوین کی۔ انھوں نے لکھا ہے کہ وفات سے تین چار سال قبل (یعنی ۱۸/ شوال ۱۱۷۹ھ/ اپریل ۱۷۶۶ء کو) شاہ صاحب نے اسے مکمل کرلیا تھا، اس کی تہذیب و تدوین میں شاہ صاحب کے ایک دوسرے شاگرد خواجہ محمد امین کا سرگرم تعاون حاصل رہا، جنھوں نے مسوی کو سامنے رکھ کر اسے پایہ تکمیل تک پہنچایا۔ ۳؎

یہ کتاب ۱۲۹۳ھ/ ۱۸۷۶ء میں فاروقی پریس دہلی سے پہلی بار زیورِ طبع سے آراستہ ہوئی۔ اس کے بعد اس کی کئی طباعتیں منظر عام پر آئیں، مثلاً مطبع مرتضوی دہلی، ۱۲۹۳ھ/ ۱۸۷۶ئ، محمد علی کارخانہ اسلامی کتب کراچی، ۱۴۰۰ھ/ ۱۹۸۰ئ، تراجم اردو، سید عبداللہ، مطبع احمدی، کلکتہ، ۱۲۹۴ھ/ ۱۸۷۷ئ، الرحیم، جلد ۱، شمارہ ۵، اکتوبر ۱۹۶۳ء (نامکمل)۔

اس کتاب میں مؤطا کی جملہ احادیث کا فارسی زبان میں ترجمہ درج ہے۔ تشریح کے ذریعہ حنفی اور شافعی نقطہ ہائے نظر کی وضاحت کی گئی ہے اور ترجیحی پہلو کی نشان دہی سے گریز کیا گیا ہے۔ بیس (۲۰) صفحات پر مشتمل ایک طویل مقدمہ ہے، جس میں فضیلتِ مؤطا، مناقبِ امام مالک، فرق استنباط، ذکر ائمہ اربعہ، مراسیل و منقطعات، ترتیب و استیعاب مؤطا، مآخذِ مؤطا، مشائخ امام مالک اور اصول رجال اسانید امام مالک پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

مصفّٰی کے ابواب درج ذیل ہیں:

جلد اول: کتاب الصلوٰۃ (ص ۲۲۔۲۰۵)، کتاب الزکوٰۃ (ص ۲۰۶۔۲۳۰)، کتاب الصیام (ص ۲۳۰۔۲۶۶)، کتاب الحج (ص ۲۶۶۔۳۳۹)، کتاب البیوع

(ص ۳۴۰۔۴۱۸)، کتاب الفرائض (ص ۴۱۸۔۴۵۰)۔

جلد دوم: کتاب النکاح (ص ۳۔۷۷)، کتاب احکام الخلافۃ (۹۳۔۱۷۲)، کتاب الاحکام المتعلقۃ بالطعام (۱۷۲۔۲۳۵)، کتاب الرقاق (۲۴۰۔۲۸۴)، کتاب سیر النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم واصحابہ (۲۸۴۔۳۱۲)۔

(۲) المسوّیٰ

شاہ صاحب نے مؤطا امام مالک کے نسخۂ مصمودی کی ایک شرح عربی زبان میں کی ہے۔ اس کا نام المسوّیٰ ہے، اس کی تالیف شاہ صاحب کی صراحت کے مطابق جمعہ ۲۶/ جمادی الاولی ۱۷۵۰ئ/ ۱۱۶۴ھ کو مکمل ہوئی۔ ۴؎ اس کی طباعتیں مطبع مرتضوی، دہلی ۱۲۹۳ئ، مکہ مکرمہ، غیر مورخہ، حیدرآباد، سندھ وغیرہ سے ہوئیں۔ اردو ترجمہ الرحیم، ج ۱، شمارہ ۵، اکتوبر ۱۹۶۳ئ، شمارہ ۶، نومبر ۱۹۶۳ء میں شائع ہوا۔

شاہ صاحب نے مسوی کے مقدمہ میں اپنے طریقِ تحقیق اور منہج بحث کی وضاحت کی ہے، جو مصفی میں نہیں ملتی ہے۔ نیز یہ کہ انھوں نے ہر مسئلہ میں شافعی اور حنفی نقطہ ہائے نظر کو پیش کیا ہے، کیونکہ یہ دونوں بنیادی فقہی مسالک ہیں، جنھوں نے امت کی علمی رہ نمائی کی قابل قدر خدمات انجام دی ہیں۔ مسوّیٰ میں انھوں نے احادیث کی ترتیب و تبویب، آیات قرآنی کے اضافے، امام مالک پر نقد وتعاقب کا دفاع اور مشکل الفاظ حدیث کی شرح پیش فرمائی ہے۔ ۵؎ اپنے منہج تحقیق کی وضاحت ان الفاظ میں کی ہے:

وقد اقتضی الحال فی بعض المواضع أن أفرّق الحدیث فی بابین، فراعیت فی ذلک شرطه المعتبر عند أهله، وفی بعضها أن أذکر حدیثاً مرّتین، فان کان باسنادین فبها، والا سقت الاسناد فی موضع وقلت: ''قال مالک باسناده

بعض مقامات پر تقاضا ہوا کہ حدیث کو دو بابوں میں تقسیم کردوں۔ ایسا کرنے میں میں نے ماہرینِ فن کی معتبر شرائط کا خیال کیا ہے۔ کبھی ضرورت کا تقاضا ہوا کہ حدیث کو دوبار ذکر کیا جائے، چنانچہ جہاں جہاں ایسا کیا ہے وہاں اگر حدیث دو سندوں سے مروی ہے تو اسے ان میں ایک سند سے ایک جگہ اور دوسری

کذا و کذا" وقد استوعبت أحادیث المؤطا وآثاره فی هذه النسخة، وکانمن قوله من السنة کذا، أوکان استنباطاً بروایة یحییٰ بن یحییٰ۔۶؎

سند سے دوسری جگہ نقل کیا ہے، ورنہ ایک سند والی حدیث میں ایک جگہ سند بیان کردی ہے اور دوسری جگہ صرف یہ ذکر کرنے پر اکتفا کیا ہے کہ امام مالک نے اپنی سند سے یہ اور یہ بیان فرمایا ہے۔ بہرحال میں نے مؤطا کی تمام احادیث وآثار کا احاطہ اس نسخہ میں کرلیا ہے۔ اس طرح امام صاحب نے جہاں جہاں یہ فرمایا ہے کہ 'یہ اور یہ سنت ہے' اس کو بھی بیان کیا ہے اور حضرت یحییٰ بن یحییٰ کی روایت میں جو استنباط ہے اس کو بھی پورا پورا بیان کیا ہے۔

شاہ صاحب نے اپنی قراءت وسماعتِ مؤطا کی سند پیش کی ہے جو اس طرح ہے:

اخبرنا بجمیع مافی المؤطا روایة یحییٰ بن یحییٰ المصمودی الاندلسی رحمه الله تعالیٰ رحمة واسعة الشیخ محمد وفد الله المکی المالکی قرة منی علیه من اوله الی آخره بحق سماعه لجمیعه علی شیخی الحرم المکی الشیخ حسن بن علی العجیمی والشیخ عبدالله بن سالم البصری المکی..... اخبرنا والدی یحییٰ بن یحییٰ اللیثی المصمودی سماعاً عن امام دار الهجرة مالک بن انس الخ۔ (مسوی بر حاشیہ مصفی، ج۱/ ۲۰-۲۱) دوسری بات یہ کہ اصحاب مالک میں یحییٰ بن یحییٰ مصمودی (م ۲۳۴ھ/ ۸۴۸ئ)، ابن قاسم (م۱۹۱ھ/ ۸۰۶ئ) اور رضیع نے ان سے روایتِ مؤطا کی ہے۔ ۷؎

ابواب مؤطا بالعموم فقہی نوعیت کے ہیں، جن میں احادیث وآثار کی گونا گونی ہے۔ مسوی کا کمال اور اختصاص یہ ہے کہ ان ابواب کی خالص فقہی توجیہ وتشریح کی گئی ہے، البتہ شاہ صاحب کا یہ وصف ومنہج مسوی کی دوسری جلد میں نظر نہیں آتا، چنانچہ دونوں جلدوں میں فقہی ابواب کی تشریح کے دو الگ الگ مناہج نظر آتے ہیں۔ ایک میں فقہی کتب کی عبارتوں کے ذریعہ ابوابِ مؤطا کی وضاحت کی گئی ہے اور دوسرے میں محض ذاتی تشریحات و اقوال ہیں۔ اس دوسرے منہج میں، جو جلد دوم کا اختصاص ہے،

احادیث کی تشریح، مشکل الفاظ کا حل اور ذاتی آراء کو ترجیح حاصل ہے۔

المصفّٰی اور المسوّیٰ کا تقابلی مطالعہ

مسوی اور مصفی کے مقدمات اختصار تر اور جامع تر کا مصداق ہیں۔ مسوّی کے مقدمہ میں تشنگی پائی جاتی ہے۔ پروفیسر محمد یٰسین مظہر صدیقی نے اس کی وجوہ پر ان الفاظ میں روشنی ڈالی ہے:

''اس کی دو وجہیں ہوسکتی ہیں: اول یہ کہ خود شاہ صاحب مسوّیٰ کے مقدمہ کو مختصر رکھنا چاہتے ہوں اور مصفی میں تفصیل دینے کے حق میں رہے ہوں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ مسوی کے بعد جب مصفی کی تکمیل کی تو ان مباحث کو ضروری سمجھ کر اس میں اضافہ فرمادیا۔ بہر حال یقینی طور سے کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ اگر کچھ کہا جاسکتا ہے تو بس یہ کہ مسوّیٰ کا مقدمہ بہت ہی مختصر، تشنہ اور ناکافی ہے اور مصفی کا مقدمہ مفصل، جامع اور کافی ہے''۔۸؎

مسوّیٰ اور مصفّیٰ کے تقابل سے دونوں کے ایجاز و اطناب کی کیفیت، نیز ان کے بعض امتیازات کا علم ہوتا ہے، جو درج ذیل ہیں:

۱۔ مصفّٰی میں امارت سے متعلق قرآنی آیات کی کثرت ہے، نیز ان کا ترجمہ فارسی زبان میں کیا گیا ہے، جو حضرت شاہ کے فارسی ترجمہ فتح الرحمن سے مختلف ہے، جب کہ مسوّیٰ میں آیات کی قلت ہے اور عربی میں ان کی ترجمانی بھی نہیں کی گئی ہے۔ گویا مصفّٰی میں احادیث سے متعلق، جب کہ مسوّیٰ میں فقہ سے متعلق بحثیں زیادہ ملتی ہیں، حالانکہ مصفّٰی کی فقہی بحثیں حجم اور کیفیت میں مسوّیٰ سے زیادہ وقیع ہیں۔

۲۔ احادیث سے علماء کے استنباطات کا ذکر مصفّٰی میں بہ کثرت ملتا ہے، جب کہ مسوّیٰ جلد اول میں اس سلسلے میں بالکل خاموشی ہے۔ البتہ علماء کے نقطۂ نظر کی وضاحت مسوّیٰ جلد دوم میں ملتی ہے۔ بہ الفاظِ دیگر مسوّیٰ کی جلد دوم میں فقہ کے مقابلہ میں احادیث کے مختلف پہلوؤں پر زیادہ توجہ صرف کی گئی ہے۔

۳۔ دونوں شروح میں حنفی اور شافعی نقطہ ہائے نظر کی وضاحت ملتی ہے، البتہ

مسویٰ کی جلد اول میں ان آراء کا بدون ترجیح تذکرہ ہے۔

۴۔ مسوّیٰ کا طریق، تعلیق وتحشیہ کا ہے، جو بہت مختصر تاویل وتشریح پر مشتمل ہے۔ چنانچہ جلد اول میں مؤطا کے ابواب اور ان کی احادیث کی تشریح وتاویل بہ مشکل نظر آتی ہے۔

۵۔ مسوّیٰ کی پہلی جلد میں زیادہ زور فقہی مباحث پر ہے، بالخصوص احناف وشوافع کے اختلافات کو دلائل کے ساتھ پیش کیا گیا ہے اور حوالے بھی نقل کیے گئے ہیں۔ معدودے چند فقہی اقوال بلاحوالہ نقل درج ہیں۔ مسوّیٰ جلد اول کی یہ شان دیگر تصانیفِ شاہ میں نظر آتی ہے۔

۶۔ مسوّیٰ کے مقابلے میں مصفّٰی کی شرح وتاویل حدیث اور فقہی مباحث مفصل ہیں، جب کہ مسوّیٰ کی ضخامت مصفّٰی کے ایک تہائی سے بھی کم ہے۔

المصفّٰی کی دونوں جلدوں میں المسوّیٰ محض تعلیق وتحشیہ کے انداز میں شائع ہوئی ہے۔ اس کی جلد اول میں فتاویٰ عالم گیری کو مرکزی حیثیت حاصل ہے، جب کہ جلد دوم میں عالم گیری کا تذکرہ بالکل نہیں ہے۔ غالباً اس کی وجہ منہاجِ شاہ کا اختلاف ہے، جو دونوں جگہوں پر واضح طور سے نظر آتا ہے۔ جلد دوم میں فقہی مسائل یا احادیث کی تشریح و تاویل میں شاہ صاحب کے ذاتی اکتسابات اور اقوال کی فراوانی نظر آتی ہے۔ چنانچہ اس میں ہدایہ کا ذکر صرف دو جگہ (ص ۳، ۴) پر ہوا ہے، جب کہ جلد اول میں اس کا تذکرہ آٹھ مقامات پر ہے (ص ۸۹، ۹۱، ۹۴، ۲۸۸، ۳۰۶، ۳۷۰ (دو بار)، ۳۸۰) اسی طرح اقوال شافعی کا ذکر صرف چار مقامات پر ہے (ص ۶، ۳۶، ۴۳، ۲۳۶)۔

المسویٰ میں فتاویٰ عالم گیری سے استناد

مسوّیٰ میں فتاویٰ عالم گیری کو مصدر ومرجع بنانے کی بنیادی وجہ ہندوستان میں سماجی مسائل کا تنوّع اور مقتدر فقہاء کے ذریعہ اس کی تفہیم معلوم ہوتی ہے۔ چنانچہ حضرت شاہ کے اس استفادہ کی وجہ سے فتاویٰ عالم گیری کا مقام ومرتبہ اور اس کا تحقیقی

معیار و مقام مزید مستحکم ہوجاتا ہے۔ برصغیر میں فتاویٰ غیاثیہ (بلبن کے دور ۱۲۶۶ء کی یادگار) پہلا فقہی مجموعہ ہے۔ اس کے بعد فتاویٰ فیروز شاہی اور فتاویٰ تاتارخانی فیروز شاہ تغلق کے عہد کے اجتماعی دواوینِ فقہ و فتاویٰ ہیں، لیکن حضرت شاہ نے صرف فتاویٰ عالم گیری ہی کو لائقِ اعتناء سمجھا، جس کی وجہ سے برصغیر کے دیگر فتاویٰ کے بالمقابل صرف اسی کو شایانِ شان شہرت حاصل ہوسکی ہے۔

یہاں یہ وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے کہ فتاویٰ عالم گیری سے اخذ و استفادہ اور اس کے حوالہ کی حیثیت متن مصفّٰی کے حاشیہ و تعلیق کی ہے، چنانچہ مصفّٰی کے فارسی متن میں احادیث و آثار کے ساتھ نمبر ۱، ۲ اور ۳ کی وضاحت مسوّیٰ میں ص ۱ قلت، ص ۲ قلت، ص ۳ قلت کے انداز سے کی گئی ہے، لہٰذا ذیل کی سطور میں ابواب وفصول یا مسائل کی جو نشان دہی ہوگی وہ دراصل مصفّٰی میں مندرج احادیث کی وضاحت ہوگی۔ اس ضمن میں یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ ''ص ۱، ۲، ۳ قلت'' کا اسلوبِ شاہ ترجیحی طور پر براہ راست فتاویٰ عالم گیری سے استفادے پر دلالت کرتا ہے اور جہاں جہاں 'وفی العالمکیریۃ' لکھا ہوا ملتا ہے وہاں دیگر مآخذِ فقہ کے ساتھ فتاویٰ عالم گیری کا ذکر مقصود ہے۔

دوسری وضاحت یہ کہ مصفی میں مذکور احادیث کے اواخر میں نمبر (۱، ۲، ۳) درج ہیں اور حاشیہ کے طور پر پوری مسوّیٰ کو درج کیا گیا ہے۔ لہٰذا اس مقالے میں نمبر شمار کے جو حوالے پیش کیے گئے ہیں وہ ابواب مصفّٰی کے ہیں۔

مسوی میں فتاویٰ عالم گیری کے پچھتّر (۷۵) حوالے موجود ہیں۔ تمام حوالوں کی تفصیلات قاری کے لیے الجھن کا باعث ہوں گی، لہٰذا یہاں صرف انتیس (۲۹) حوالوں کی تفصیل پیش کی جارہی ہے اور ان کا اردو میں ترجمہ کردیا گیا ہے۔ باقی حوالوں کے صرف صفحات کی تعیین کردی گئی ہے۔۹؎

۱۔ فقہاء کا اتفاق ہے کہ عمل قلیل سے نماز باطل نہیں ہوگی۔ عالم گیریہ میں ہے کہ اگر نمازی اپنے کندھے پر کسی بچے کو بٹھالے یا کوئی کپڑا رکھ لے تو اس کی نماز فاسد نہیں ہوگی، لیکن اگر کوئی ایسی چیز کندھے پر رکھے جسے اٹھائے رہنے میں اسے

مشقت ہوتو اس کی نماز فاسد ہوجائے گی۔ (کتاب الصلوٰۃ، باب العمل الیسیر لایبطل الصلوٰۃ، ۱/۱۲۴)

۲۔ عالم گیریہ میں ہے کہ اگر مقتدی امام سے قبل رکوع اور سجدہ سے اپنا سر اٹھالے تو دوبارہ سر جھکالے۔ ایسا کرنے سے اس کے دو رکوع اور دو سجدے نہیں ہوجائیں گے۔ (کتاب الصلوٰۃ، باب یجب اتباع الامام فی جمیع الحالات، ۱/۳۳)

۳۔ عالم گیریہ میں ہے کہ مستحب قراءت سے زیادہ قراءت نہ کرے اور مقتدیوں کو مشقت میں مبتلا نہ کرے، بلکہ تکمیل اور استحباب کے ساتھ تخفیف سے کام لے۔ (کتاب الصلوٰۃ، باب علی الامام ان یخفف فی الصلوٰۃ، مسوی، ۱/۱۳۴)

۴۔ عالم گیریہ میں ہے کہ چھوٹی ہوئی نماز اور ادا نماز کے درمیان، اسی طرح چھوٹی ہوئی نمازوں کے درمیان ترتیب ہونی چاہیے۔ چنانچہ بغیر عذر کے چھوٹی ہوئی نماز کی قضا سے قبل وقت کی نماز پڑھنا جائز نہیں ہے۔ (باب یقضی الفائتۃ قبل الوقتیۃ، ۱/۱۴۰)

۵۔ عالم گیریہ میں ہے کہ سنتوں کی قصر نہیں ہے۔ بعض فقہاء نے مسافر کے لیے سنتوں کا ترک کرنا جائز قرار دیا ہے، مسلک مختار یہ ہے کہ نمازی حالتِ خوف میں سنتیں نہیں پڑھے گا، لیکن امن وسکون کی حالت میں انھیں پڑھے گا۔ (باب قضاء فائتۃ السفر بیان قضاء فائتۃ السفر، ۱/۱۴۵)

۶۔ عالم گیریہ میں ہے کہ اس معاملے میں نمازی نماز کا آغاز قبلہ رخ ہوکر کرے یا ابتدا میں اس جانب اس کی پشت ہو، دونوں برابر ہے۔ اکثر فقہاء کہتے ہیں کہ سواری پر وتر کی نماز پڑھنی جائز ہے۔ حنفیہ کہتے ہیں کہ جائز نہیں۔ (باب جواز التنفل علی الدابۃ فی السفر حیث ماتوجھت بہ، ۱/۱۴۶)

۷۔ عالم گیریہ میں ہے کہ مریض اور مسافر سے جمعہ ساقط ہونے کے اسباب میں سے یہ بھی ہے کہ شدید بارش ہورہی ہو یا ظالم بادشاہ کے خوف سے وہ روپوش ہوں۔ البتہ اگر وہ ادا کرلیتے ہیں تو فرض ادا ہوجائے گا، ورنہ صرف نیت کرلیں تب بھی کافی ہوگا۔ (باب لاجمعۃ علی مریض ولامسافر، فان صلاھا احدھما وقعت عن

الفرض وان امّ فیھا جاز ۔ا/ ۱۵۶)

۸۔ عالم گیریہ میں ہے کہ سنت اگر اپنے وقت پر ادا نہ کی جا سکے تو اس کی قضا کی ضرورت نہیں ہے، البتہ فجر کی سنت کا اس سے استثنا ہے، کہ اگر فجر کی فرض نماز بھی چھوٹ گئی ہو تو زوال سے پہلے فجر کی فرض اور سنت دونوں کی قضا کر لینی چاہیے، تنہا سنت کی قضا لازم نہیں ہے، البتہ امام محمدؒ کہتے ہیں کہ تنہا فجر کی سنت کی بھی قضا کر لینی چاہیے۔ (باب قضاء رکعتی الفجر، ا/ ۱۶۵)

۹۔ نوافل کو گھر میں ادا کرنا چاہیے۔ عالم گیریہ میں ہے کہ تراویح کے علاوہ باقی تمام نوافل کو گھر میں پڑھنے کا اہتمام کرنا چاہیے۔ البتہ مسجد اور گھر دونوں جگہیں اس معاملہ میں برابر ہیں، لیکن ریا کاری سے دور رہنے کی کوشش کرنی چاہیے اور اخلاص پیدا کرنا چاہیے۔ (باب الافضل للنافلۃ ان تکون فی البیوت، ا/ ۱۶۷)

۱۰۔ عالم گیریہ میں ہے کہ مباح وقت میں نماز جنازہ اور سجدۂ تلاوت اگر واجب ہو جائیں تو انھیں مکروہ وقت تک مؤخر کرنا جائز نہیں ہے، البتہ اگر وہ مکروہ وقت میں واجب ہوئے ہوں تو ان اوقات کے اندر ان کی ادائی میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ (باب خمس ساعات یکرہ الصلوٰۃ فیھا، ا/ ۱۹۴)

۱۱۔ امام شافعی کے نزدیک نماز جنازہ میں فاتحہ کی قراءت فرض ہے جب کہ اس میں احناف قراءتِ فاتحہ کی فرضیت کے قائل نہیں ہیں۔ عالم گیریہ میں ہے کہ اگر دعا کی نیت سے فاتحہ پڑھی تو کوئی مضائقہ نہیں، لیکن اگر قراءت کی نیت سے پڑھی تو ناجائز ہے۔ (باب ھل یقرأ الفاتحۃ فی صلوۃ الجنازۃ، ا/ ۲۰۰)

۱۲۔ عالم گیریہ میں ہے کہ ابن شہابؒ نے نماز جنازہ میں چھوٹی ہوئی تکبیر کو امام کے سلام پھیرنے کے بعد ادا کیا۔ (باب المسبوق فی صلاۃ الجنازۃ کیف یفعل، ا/ ۲۰۱)

۱۳۔ عالم گیریہ میں ہے کہ مصیبت کا مارا نوحہ اور سینہ کوبی نہیں کرے گا، البتہ رقّتِ قلب کے ساتھ پست آواز میں رونا جائز ہے۔ (باب ما یقولہ المصاب، ا/ ۲۰۳)

۱۴۔ عالم گیریہ میں ہے کہ دفن کرنے کے بعد قبر کھودنا جائز نہیں ہے، البتہ اگر زمین غصب والی ہو، یا حق شفعہ کا خیال نہ رکھا گیا ہو تو ایسی قبر کھودی جاسکتی ہے۔ اگر مردہ کو قبلہ رخ نہ لٹایا گیا ہو تو قبر نہیں کھودی جائے گی، البتہ اگر قبر میں کوئی قیمتی چیز چھوٹ گئی ہو تو اسے نکالنے کے لیے قبر دوبارہ کھودی جاسکتی ہے۔ (باب تحریم النبش، ۱/ ۲۰۵)

۱۵۔ عالم گیریہ میں ہے کہ قبر پر عمارت تعمیر کرنا یا اس پر بیٹھنا یا سونا یا ٹیک لگانا یا پیشاب پاخانہ کرنا جائز نہیں ہے۔ (باب القعود علی القبور والتوسد علیھا، ۱/ ۲۰۵)

۱۶۔ عالم گیریہ میں ہے کہ زکوٰۃ ایسا فرض ہے جس کا انکار کرنے والا قتل کردیا جائے گا اور وہ کافر قرار پائے گا۔ (باب قتال من منع الزکوٰۃ، ۱/ ۲۰۷)

۱۷۔ حضرت عمرؓ نے جانوروں کا نصاب متعین کیا تھا، جس کی رو سے ایک چراگاہ یا مختلف چراگاہوں میں شرکت یا غیر شرکت کے جانور کسی کے پاس ہوں تو دونوں کو ملا کر نصاب متعین کیا جائے گا۔ (باب کتاب عمر رضی اللہ عنہ فی الصدقۃ، ۱/ ۲۱۰)

۱۸۔ جس شخص کے پاس بدن ڈھانپنے کے بعد ایک دن کی خوراک نہ ہو، صرف وہی فقیر ہے۔ ایسے فرد کے لیے صدقہ لینا جائز ہے۔ (باب النھی عن السوال لمن یقدر علی الکسب او عندہ نحو اوقیۃ، ۱/ ۲۲۹)

۱۹۔ حدیث میں چاند دیکھ کر روزہ رکھنے اور چاند دیکھ کر روزہ نہ رکھنے کا حکم دیا گیا ہے۔ عالم گیریہ میں ہے کہ زوال سے قبل یا اس کے بعد اگر چاند نظر آجائے تو اس کو دیکھ کر روزہ رکھا جائے گا نہ افطار کیا جائے گا، کیوں کہ یہ چاند آنے والی رات کی علامت ہے۔ (باب یجب الصوم والفطر برویۃ الھلال فان غم اکملوا ثلثین ثم صاموا او افطروا، ۱/ ۲۳۶)

۲۰۔ طلوع فجر کے سلسلے میں اس کی ابتدا کا اعتبار ہوگا یا سورج کے پھیل

جانے کا اور اس کے پورے طور پر نمایاں ہونے کا؟ عالم گیریہ میں ہے کہ پہلی صورت کا اعتبار کرنا احتیاط کا تقاضا ہے۔ (باب یاکل ویشرب حتی یتبین الصبح المستطیر، ۱/۲۳۷)

۲۱۔ عالم گیریہ میں ہے کہ اگر مسافر کو گمان گزرے کہ ابھی فجر طلوع نہیں ہوئی ہے، حالاں کہ طلوعِ فجر ہو چکا ہو۔ اسی طرح اگر اسے یہ گمان گزرے کہ سورج غروب ہو چکا ہے، حالاں کہ ابھی اس کے غروب ہونے میں کچھ وقت باقی ہو تو وہ اس دن کے روزے کی قضا کرے گا، البتہ اس کے اوپر کفارہ لازم نہیں آئے گا۔ (باب المسافر اذا اراد ان یدخل بلدہ اول یوم یستحب لہ الصوم۔ ۱/۲۴۵)

۲۲۔ عالم گیریہ میں ہے کہ علماء کی اکثریت کے نزدیک تنہا یوم عاشوراء کا روزہ رکھنا مکروہ ہے۔ مستحب یہ ہے کہ نویں اور دسویں دونوں ایام کا روزہ رکھ لیا جائے۔ (باب یستحب صوم یوم عاشورائ، ۱/۲۵۴)

۲۳۔ رمضان کے بعد شوال کے چھ روزہ رکھنے کو صحیح مسلم کی حدیث میں صوم الدہر کہا گیا ہے۔ امام شافعیؒ کا قول ہے کہ یہ عمل مستحب ہے اور رمضان کے فوراً بعد ایک ساتھ چھ روزہ رکھنا افضل ہے، البتہ ابوحنیفہؒ کہتے ہیں کہ الگ الگ یا ملا کر دونوں مکروہ ہیں، ابو یوسف کہتے ہیں کہ ملا کر رکھنا مکروہ ہے، البتہ الگ الگ رکھنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ عالم گیریہ میں اس کو مستحب قرار دیا گیا ہے۔ (باب صوم ستۃ من شوال، ۱/۲۵۶)

۲۴۔ عالم گیریہ ہے کہ اگر دوران اعتکاف شوہر بھول کر بھی دن یا رات میں اپنی بیوی سے ہم بستری کرلے تو خواہ مادۂ منویہ باہر آئے یا نہ آئے، اس کا اعتکاف فاسد ہوجائے گا۔ (باب یحرم علی المعتکف مباشرۃ المرأۃ، ۱/۲۶۴)

۲۵۔ مزدلفہ میں مغرب وعشاء کو جمع کرنے کا حکم ہے۔ عالم گیریہ میں ہے کہ وہاں جمع بین الصلوتین کے لیے خطبہ، سلطان، جماعت اور احرام وغیرہ شرائط میں سے نہیں ہیں۔ (باب یجمع بین المغرب والعشاء بمزدلفۃ، ۱/۳۲۲-۳۳۲)

۲۶۔ طواف صدر کے بارے میں عالم گیریہ میں ہے کہ حاجی جب مکہ سے نکلنے کا ارادہ کرے تو اس پر طواف وداع واجب ہے، البتہ اہل مکہ اور عمرہ کرنے والے پر طواف صدر واجب نہیں ہے۔(باب طواف الوداع، ۱/۳۳۱)

۲۷۔ جو شخص سواری پر نہیں بیٹھ سکتا اس کی جانب سے حج کے سلسلے میں عالم گیریہ میں ہے کہ حج کی شرائط میں سے ہے کہ آدمی صحت مند ہو۔ اگر اس کا کولہا خراب ہو، وہ کسی موذی مرض میں مبتلا ہو، مفلوج ہو یا اس کے دونوں پاؤں کٹ گئے ہوں تو ایسے شخص پر حج واجب نہیں ہے۔ ایسا شخص نہ کسی سے حج کرواسکتا ہے اور نہ اس کی جانب سے کوئی دوسرا شخص حج کرسکتا ہے، البتہ وارث اپنے مورث کی اجازت کے بغیر حج کرسکتا ہے اور یہ حج ادا ہو جائے گا۔ (باب الحج عمن لا یستطیع ان یثبت علی الراحلۃ، ۱/۳۳۶)

۲۸۔ خرید وفروخت کے لیے طرفین کا جائز شرائط پر معاہدہ کرنا ضروری ہے۔ اس ضمن میں عالم گیریہ میں ہے کہ اس کی شرائط میں مال کا فی نفسہٖ موجود ہونا، بائع جو چیز بیچنا چاہتا ہے اس کا تعلق اسی سے ہونا، مال کا ظاہر ہونا، کسی نہ کسی حال میں رضا مندی کا ہونا وغیرہ، ضروری ہیں۔ دوسری بات یہ کہ بعض خریداری ایسی ہوتی ہے جس میں کوئی فائدہ نہیں ہوتا، یا وہ بیع وشراء فاسد ہوتی ہے، مثلاً درہم کا درہم کے ذریعے وزن اور صفت میں برابر ہونا۔ یہ بیع فاسد کہلاتی ہے۔(باب یشترط فی کل عقد ان یکون بتراضی العاقدین وان لا یکون عقداً علی باطل۔ ۱/۳۴۲)

۲۹۔ اجرت پر لین دین کے ضمن میں عالم گیریہ کی تفصیلی عبارت درج کی گئی ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ اجرت پر لینے والے کو اجرت پر دینے کا اختیار ہے، ان چیزوں میں جن کی طرف لوگ زیادہ مائل نہیں ہوتے ہیں، مثلاً اجرت پر گھر لینے کے بعد اسی قدر رقم پر یا زیادتی کے ساتھ دوسرے شخص کو اجرت پر دینا جائز ہے، البتہ اگر اسی جنس میں زیادتی ہوگی تو یہ ناپسندیدہ عمل ہوگا۔(باب الاجارۃ، ۱/۳۹۲)

تجزیہ اور خلاصۂ بحث

گذشتہ بحث کا خلاصہ درج ذیل نکات کی شکل میں بیان کیا جا سکتا ہے:

۱۔ فتاوی عالم گیری کو شاہ ولی اللہؒ نے مصفّٰی میں وارد تقریباً پچہتر (۷۵) احادیث و آثار کے ضمن میں مرجع ومصدر کے طور پر استعمال کیا ہے۔ اور یہی پوری تفصیل مسوی کی جلد اول کہلاتی ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے:

الف۔ کتاب الصلوٰۃ (ص ۲۲۔۲۰۵)، تیس (۳۰) جگہوں پر عالم گیریہ سے استفادہ ہے۔

ب۔ کتاب الزکوٰۃ (ص ۲۰۶۔۲۳۰)۔ پانچ (۵) جگہوں پر عالم گیریہ سے حوالے پیش کیے گئے ہیں۔

ج۔ کتاب الصیام (ص ۲۳۰۔۲۶۶)۔ نو (۹) مقامات پر عالم گیریہ کی عبارتیں موجود ہیں۔

د۔ کتاب الحج (ص ۲۶۶۔۳۳۹)۔ انتیس (۲۹) مسئلوں میں عالم گیریہ سے فقہی استفادہ کیا گیا ہے۔

ر۔ کتاب البیوع والمعاملات (ص ۳۴۰۔۴۱۸)۔ دو جگہ عالم گیریہ کا حوالہ ہے۔

س۔ کتاب الفرائض (ص ۴۱۸۔۴۵۰)۔ ایک مقام پر عالم گیریہ کا ذکر موجود ہے۔

مسوی کا الگ سے مطالعہ نہیں کیا جا سکتا، کیونکہ نہ اس کی فہرست موجودہ نسخے میں موجود ہے اور نہ الگ سے مخطوطہ دستیاب ہے۔ ☆

۲۔ شاہ ولی اللہؒ کا عالم اسلام کے دیگر مجامیع و مآخذ فقہیہ کے مقابلے میں فتاویٰ عالم گیری سے اس کثرت سے استفاہ برصغیر کے فقہی سرمائے کو علمی وقار عطا کرتا ہے۔ اس ضمن میں مؤطا کے متعلقہ ابواب اور عالم گیریہ کا الگ الگ مطالعہ کیا جانا چاہیے۔

۳۔ مسویٰ کی جلد اول میں دیگر کتب فقہ سے بھی استفادہ نظر آتا ہے۔ شاہ صاحب بسا اوقات مسئلہ زیر بحث میں عالم گیریہ کے پہلو بہ پہلو چند اور کتبِ فقہ (ہدایہ، نورالانوار، شرح السنۃ، المنہاج) کا حوالہ اپنی تشریح کی تائید میں پیش کرتے ہیں۔ چنانچہ

☆ المسویٰ کا نیا ایڈیشن ابھی حال میں (۱۴۳۴ھ/ ۲۰۱۳ئ) مولانا سید سلمان حسینی ندوی کی تقدیم و مراجعہ کے ساتھ المعہد العالی للدراسات الشرعیۃ، دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ سے شائع ہوا ہے۔ (رضی الاسلام)

سولہ (۱۶) مقامات پر عالم گیریہ کے ساتھ المنہاج کا بھی حوالہ دیا گیا ہے: (صفحات: ۱۲۴، ۱۳۹، ۱۵۶، ۱۶۵، ۲۰۱، ۲۱۸، ۲۲۹، ۲۳۷، ۲۴۸، ۲۷۰، ۲۷۳، ۲۷۵، ۲۷۹، ۲۸۵، ۳۲۳، ۳۳۰)۔البتہ انھوں نے ان اقوال میں سے کسی کو ترجیح نہیں دی ہے۔

۴۔ عالمی ملت اسلامیہ میں احناف وشوافع کی غالب اکثریت کو متوازن فقہی رویے کی آگہی فراہم کرنا شاہ صاحب کی تطبیقی کاوشوں کا وہ سنہرا باب ہے جس کی بازگشت مسوی میں بھی سنائی دیتی ہے۔ چنانچہ برصغیر کے احناف کے لیے فتاویٰ عالمگیری اور شوافع کے لیے المنہاج اور نووی کی شرح السنۃ پر انحصار اسی فکر کا غماز ہے۔

۵۔ مسویٰ میں دیگر کتب فقہ یا فقہ الحدیث پر مشتمل کتب سے بھی استفادہ ملتا ہے، جس کی تفصیل درج ذیل ہے:

الف۔ الہدایۃ، آٹھ (۸) بار۔ احادیث کے فقہی پہلوؤں کی وضاحت ملتی ہے۔

ب۔ شرح السنۃ، بتیس (۳۲) بار۔ مسویٰ میں حاشیے کی حیثیت سے مصفی کی احادیث/آثار کی وضاحت کی گئی ہے۔

ج۔ المنہاج: سولہ (۱۶) مقامات پر عالم گیریہ کے ساتھ اور سترہ مقامات پر تنہا یا کسی دوسرے فقہی مصدر کے ساتھ اس کا حوالہ مذکور ہے۔

د۔ الوقایۃ: بیس (۲۰) مسئلوں میں استفادہ کیا گیا ہے۔

یہاں اس امر کا اظہار بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ مذکورہ بالا کتابوں کے علاوہ بھی فقہی مصادر کی ایک معتد بہ تعداد کا تذکرہ مسوی میں پایا جاتا ہے، جن کا ذکر طوالت کے خوف سے نہیں کیا جارہا ہے۔

۶۔ شاہ صاحب نے مسوی اور مصفّیٰ کی تدوین کا کام مؤطا کی احادیث ہی کو سامنے رکھ کر انجام دیا ہے۔ مصفی ان کی حیات ہی میں پایۂ تکمیل کو پہنچ گئی تھی، لیکن اس کی اشاعت ان کی وفات کے کئی سال بعد ہوئی۔ مرتبین نے دونوں کے متون کو اس طرح ملا دیا ہے کہ وہ بالکل جڑواں نظر آتے ہیں۔ اور قلت کا لفظ اشارہ کررہا ہے کہ شاہ صاحب نے قصداً دونوں کے متون کو 'توأم' بنانے کی دانستہ کوشش کی تھی۔

۷۔ مصفّیٰ کے متن میں ابواب بندی کا کام عربی زبان ہی میں کیا گیا ہے،

جو ظاہر ہے کہ مؤطا سے پوری طرح ہم آہنگ ہے۔ ابواب کا ترجمہ فارسی میں وہیں پر کر دیا گیا ہے اور ہر حدیث/ اثر کے سامنے نمبر دے کر قلت کے ذریعہ مسوی میں اس کے اغلاق کو فقہی مسائل میں کھول دیا گیا ہے۔

۸۔ مسوی کی جلد اول میں کتب فقہ بالخصوص فتاویٰ عالم گیری اور المنہاج سے مصفی کی عبارتوں یا احادیث مؤطا کی وضاحت کی گئی ہے، لیکن یہ امر ہنوز لاینحل ہے کہ جلد اول کی مانند جلد ثانی کے فقہی ابواب وفصول کی تشریح میں کتب فقہ اور خاص طور پر فتاوی عالم گیری سے استفادہ کیوں نہیں کیا گیا ہے؟

۹۔ مسوی جلد دوم میں اگرچہ شوافع واحناف کے نقطہ ہائے نظر کی وضاحت ملتی ہے، لیکن مصادر سے استفادہ برائے نام ہے۔ اس جلد میں الہدایۃ سے استفادہ صرف دو جگہوں پر (ص ۴۳)، المنہاج سے صرف ایک مقام پر (ص ۴)، نورالانوار سے پانچ مقامات پر (ص ۶، ۲۳، ۲۴، ۲۵، ۱۴۹) اور شرح السنہ سے صرف ایک مقام پر (ص ۶) کیا گیا ہے۔

حواشی ومراجع:

۱۔ شاہ ولی اللہ، مصفی، مالکان کتب خانہ رحیمیہ سنہری مسجد، دہلی، غیر مورخہ، ج اول، ص ۳، شاہ ولی اللہ، مسوی، مالکان کتب خانہ رحیمیہ، سنہری مسجد، دہلی، غیر مورخہ، ج اول، ص ۸

۲۔ شاہ ولی اللہ، مصفّٰی، حوالہ سابق، ۱/ ۶

۳۔ محمد یٰسین مظہر صدیقی، شاہ ولی اللہ کی خدمات حدیث، حضرت شاہ ولی اللہ اکیڈمی پھلت، ضلع مظفر نگر، ۲۰۰۴ئ، ص ۱۷۳۔ ۱۷۴

۴۔ مسوی برحاشیہ المصفی، کتب خانہ رحیمیہ دہلی، حوالہ سابق، ۲/ ۳۱۵

۵۔ مسوی، حوالہ سابق، ۱/ ۱۰۔۱۱

۶۔ مسوی، حوالہ سابق، ۱/ ۱۸۔۱۹

۷۔ مصفی، حوالہ سابق ۱/ ۷

۸۔ شاہ ولی اللہ کی خدمات حدیث، ص ۳۸۲

۹۔ ملاحظہ ہوں مسویٰ جلد اول کے درج ذیل صفحات: ۹۸، ۱۰۹، ۱۳۸، ۱۳۹، ۱۴۲، ۱۴۳، ۱۵۲، ۱۵۵، ۱۶۱، ۱۶۵، ۱۶۸، ۱۷۱، ۱۷۳، ۱۷۹، ۱۸۲، ۲۰۱، ۲۵۲، ۲۵۶، ۲۶۱، ۲۶۲، ۲۷۰، ۲۷۱، ۲۷۳، ۲۷۴، ۲۷۵، ۲۸۹، ۲۸۵، ۲۹۹، ۳۰۶، ۳۰۹، ۳۱۵، ۳۱۶، ۳۱۷، ۳۱۹، ۳۲۲، ۳۲۳، ۳۲۵، ۳۲۸، ۳۲۹، ۳۳۰، ۳۳۱، ۳۳۷، ۳۳۹۔

☆☆☆

وقت کے ایک اہم اور زندہ موضوع پر قابلِ قدر تصنیف

غیر مسلموں سے تعلقات اور ان کے حقوق

مولانا سید جلال الدین عمری

مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان کیسے تعلقات ہونے چاہئیں؟ یہ آج کا ایک اہم اور زندہ موضوع ہے۔ کیا اسلام اپنے ماننے والوں کے علاوہ دوسروں کو بنیادی انسانی حقوق سے محروم کردیتا ہے؟ کیا اس میں مذہبی رواداری تحمل و برداشت اور توسع نہیں پایا جاتا ہے؟ اسلام کے نزدیک غیر مسلموں سے خاندانی، معاشرتی، سماجی، کاروباری اور ازدواجی تعلقات کی نوعیت کیا ہے؟ غیر مسلموں کو سلام، مساجد میں ان کا داخلہ اور ان سے تحائف کے تبادلہ کا کیا حکم ہے؟ کیا مسلمانوں کے معاملات میں ان کی گواہی قبول کی جاسکتی ہے؟ اسلامی ریاست کی بنیادیں کیا ہیں؟ اور اس پر کیا اعتراضات کیے جاتے ہیں؟ جہاد کیا ہے اور اس کے احکام کیا ہیں؟ ذمیوں کے کیا حقوق ہیں؟ اسلامی ریاست کے بین الاقوامی تعلقات کی نوعیت کیا ہے؟ غیر مسلموں سے عدم تعلق کی ہدایات کا صحیح پس منظر کیا ہے؟ یہ چند ایسے اہم مسائل ہیں جن کا جدید ذہن اطمینان بخش جواب چاہتا ہے۔

کتاب میں اس نوع کے تمام مباحث پر قرآن وحدیث کی روشنی میں اور مستند مفسرین، محدثین اور فقہاء کے حوالوں کے ساتھ عالمانہ اظہار خیال کیا گیا ہے۔ ہندوستان کے پس منظر میں اس کی خصوصی اہمیت ہے اور دعوت وتبلیغ کے میدان میں کام کرنے والوں کی بھی یہ ایک اہم ضرورت ہے۔

مصنف کی نظر ثانی کے بعد جدید ایڈیشن، آفسیٹ کی حسین طباعت، عمدہ کاغذ، خوب صورت جلد، صفحات: ۳۲۰، قیمت: ۱۸۵/- روپے

اجتہاد اور اس کا تاریخی ارتقاء

پروفیسر محمد انس حسان

اجتہاد کی تعریف

اجتہاد کے لغوی معنی ہیں کسی مقصد کو حاصل کرنے کی انتہائی کوشش کرنا، زحمت برداشت کرنا اور مشقت اٹھانا۔ اصطلاح میں اس سے مراد وہ کوشش ہے جو کسی قضیے یا حکم شرعی کے بارے میں بحدِ امکان ذاتی رائے (ظن غالب) قائم کرنے کے لیے کی جائے۔ اجتہاد کا مادہ 'جہد' ہے، جس کے معنی کوشش، محنت اور سعی کرنے کے ہیں۔ یعنی کسی مقصد کو پانے کے لیے استدلال کے پہلو سے اپنی تمام کوشش صرف کر دینا، ظن و گمان کے درجہ میں کسی شے کے حکمِ شرعی کو تلاش کرنے کے لیے اپنی تمام کوشش صرف کر دینا۔

مولانا محمد تقی امینیؒ (۱۹۲۶-۱۹۹۹ئ) نے اجتہاد کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے:

> ''اجتہاد کے لغوی معنٰی ہیں کسی بات کی تحقیق میں انتہائی جدوجہد کرنا۔ کلامِ عرب میں یہ لفظ ایسی جدوجہد میں استعمال ہوتا ہے جس میں محنت شاقہ برداشت کرنی پڑے۔ چنانچہ اجتھد فی حمل الرحاۃ (چکّی کا پاٹ اٹھانے میں اس نے جدوجہد کی) کہنا درست ہے اور اجتھد فی حمل خردلۃ (رائی کا دانہ اٹھانے میں اس نے جدوجہد کی) کہنا صحیح نہیں ہے''۔[۱]

شیخ محمد ابوزہرہؒ (۱۸۹۸-۱۹۷۴ئ) فرماتے ہیں:

> ''فقہ اسلامی میں اجتہاد یہ ہے کہ فقیہ دلائل شرعیہ سے عملی احکام مستنبط کرنے کی کوشش کرے اور اس کوشش میں اپنی تمام قوت کو کھپا دے۔''[۲]

ڈاکٹر صبحی محمصانی (۱۹۰۹۔۱۹۸۶ئ) نے اجتہاد کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے:

''اجتہاد کے لغوی معنی امکانی کوشش صرف کرنے کے ہیں اور اصطلاح شرع میں اس امکانی کوشش کے صرف کرنے کا نام ہے جو دلائل شرعیہ کے ذریعے استنباطِ احکام کے لیے کی جائے۔ بہ الفاظ دیگر وہ کوشش جو مذکورۃ الصدر اصولِ اساسی کی وساطت سے احکامِ شرع کے استخراج کے لیے کی جائے۔'' ۳؎

اجتہاد ایک بے لاگ اور انتھک کوشش کا نام ہے۔ گویا اس میں احکامِ ادلّہ سے استفادہ کرتے ہوئے اور دینی مصالح کے پیش نظر اس طرح احکام کی تشریح وتوضیح کی جاتی ہے جو زمانہ سے مطابقت رکھتے ہوئے بھی دین کی تعلیمات سورس کی روح کے خلاف نہ ہوں۔

مولانا گوہر رحمن (۱۹۳۶۔۲۰۰۳ئ) رقم طراز ہیں:

''اجتہاد کسی مجتہد اور فقیہ کی اس علمی تحقیق و کاوش اور پوری علمی قوت صرف کرنے کو کہتے ہیں جو غیر منصوص مسائل (نئے مسائل) کے احکام شرعیہ معلوم کرنے کے لیے کی جائے۔ معلوم ہوا کہ اجتہاد صرف نئے مسائل کو منصوص مسائل پر قیاس کرنے ہی کو نہیں کہا جاتا، بلکہ قرآن وسنت کی نصوص کو سمجھنے، ان کی تفسیر اور تشریح کرنے کو بھی اجتہاد کہا جاسکتا ہے۔'' ۴؎

ڈاکٹر محمود احمد غازی (۱۹۵۰۔۲۰۱۰ئ) نے اجتہاد کے معنی میں 'انتہائی کوشش' کے مفہوم کی وضاحت بڑے دل کش انداز میں کی ہے۔ لکھتے ہیں:

''اجتہاد کے لفظی معنی ہیں انتہائی کاوش اور انتہائی کوشش۔ یہ انتہائی کا لفظ اس کے مفہوم میں شامل ہے۔ فقہاء نے اس کی تعریف کی ہے: 'استفراغ الوسع'۔ استفراغ کے معنی ہیں ایگزاسٹ (exhast) کرنا اور وسع کے معنی ہیں صلاحیت۔ انگریزی میں اجتہاد کے مفہوم کو بیان کرنا ہو تو یوں کہا جائے گا:

To exhast your capacity to discover Shariah ruling about a new situation in the light of the Quran and Sunnah.

یعنی قرآن وسنت کی روشنی میں کسی نئی صورتحال کا حکم معلوم کرنے کے لیے اپنی صلاحیت کو پورے طور پر استعمال کرڈالنا، علم اور صلاحیتوں کو اس طرح نچوڑ دینا کہ اس سے آگے صلاحیت کے استعمال کرنے کی کوئی حد یا سکت باقی نہ رہے۔ اس عمل کا نام اجتہاد ہے۔"۵؎

اجتہاد کی تعریف سے مجتہد اور محلِ اجتہاد کی تعریف بھی معلوم ہوجاتی ہے۔ مجتہد وہ ہے جو احکامِ شرعیہ کے جاننے کے لیے اپنی پوری قوت صرف کردیتا ہے اور محلِ اجتہاد وہ مسائل ہیں جن کے بارے میں کوئی نصِ قطعی وارد نہیں۔۶؎

اجتہاد ایک عملِ پیہم اور جہدِ مسلسل کا نام ہے جو ابتدائے اسلام سے لے کر قیامت تک جاری رہے گا۔ اس کی مثال سائنس جیسی ہے۔ جس طرح سائنس میں مبادیات اور اصولوں کی روشنی میں ایک نامعلوم چیز کو معلوم کیا جاتا ہے، اسی طرح اجتہاد میں بھی قرآن، حدیث، اجماع اور اصول ومبادی کو پیش نظر رکھتے ہوئے کسی مسئلہ میں جو شرعی حکم دریافت کیا جاتا ہے اسے اجتہاد کہتے ہیں۔ پھر جیسے سائنس میں کبھی کسی حتمی رائے کے بعد کوئی نئی دریافت ہوتی ہے جس سے پہلی تحقیق کا رد ہوتا ہو تو اس کو قبول کرلیا جاتا ہے اور پہلی تحقیق پر عمل چھوڑ دیا جاتا ہے، اسی طرح اجتہاد میں بھی اگر کسی مجتہد نے کوئی رائے قائم کی یا اپنی کوئی تحقیق پیش کی اور بعد کی تحقیق نے اس کا غلط ہونا ثابت کردیا تو پچھلی تحقیق پر عمل چھوڑ دیا جائے گا اور نئی صائب تحقیق پر، جو کہ قرآن وسنت سے زیادہ قریب ہو، عمل کیا جائے گا۔

یہ کہنا شاید غلط نہ ہوگا کہ سائنسی انداز فکر کے خالص مذہبی استعمال کو 'اجتہاد' کہا جاتا ہے۔ جس طرح سائنس ترقی پذیر ہے اور اپنا ارتقائی سفر مکمل کررہی ہے، اسی طرح اجتہاد بھی ایک ترقی پذیر عمل ہے جو بدلتی ہوئی تہذیب وتمدن اور انسان کے معاشرتی ارتقاء پر اپنا اثر چھوڑ رہا ہے اور تاابد چھوڑتا رہے گا۔ تاریخی تجزیہ کے طور پر ہم

یہ نتیجہ بھی اخذ کر سکتے ہیں کہ جدید دور کے سائنسی انداز و منہج کا اصل منبع و سرچشمہ فکر اسلامی ہے۔ دوسرے لفظوں میں تاریخ اسلام کے ابتدائی پانچ چھ سو سالوں میں اسلامی قوانین کے استنباط و استخراج کے لیے جو اصول و منہج اختیار کیا جاتا رہا اسی کا پرتو ہمیں بعد کی صدیوں میں ابھرنے والے سائنسی انداز اور منہج میں کارفرما نظر آتا ہے۔ اس بات کو یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ اسلام جدید دور کا خالق ہے۔ اگر قرآنی سوچ اور قرآنی و اسلامی فکر کا دنیا میں غلبہ اور پھیلاؤ نہ ہوتا تو دنیا آج بھی دور جاہلیت اور تاریکی کے اندھیروں میں رہ رہی ہوتی۔ خلاصۂ کلام یہ کہ فقہ اسلامی کا اہم رکن اجتہاد اس چیز کا بہت بڑا ثبوت ہے کہ اسلام سائنسی سوچ اور اپروچ کا خالق اور پروموٹر (Promoter) ہے۔

اسلام دینِ فطرت ہے۔ گویا اسلامی احکام کو انسانی فطرت کے قریب کرنے کے لیے اسلامی شریعت کے اصولوں میں لچک اور اعتدال کو ملحوظ رکھا گیا ہے، تاکہ کسی پر گراں نہ گزرے اور مسلمان اپنے مذہب سے برگشتہ نہ ہوجائیں۔ چوں کہ تہذیب و تمدن اور معاشرہ ہمیشہ ایک جیسا نہیں رہتا اور ان میں تبدیلیاں وقوع پذیر ہوتی رہتی ہیں، اس لیے انسان کو آسانی اور سہولت دینے کی غرض سے عمل اجتہاد کو فروغ دیا گیا ہے، تاکہ مسلمان اس سے استفادہ کرتے ہوئے اپنے مذہب میں وہ جمود پیدا نہ ہونے دیں جو اس سے قبل کے دیگر مذاہب کو دیمک کی طرح چاٹ گیا۔

شرائطِ اجتہاد

اجتہاد کا عمل جتنا ضروری ہے اس سے کہیں زیادہ نازک ہے۔ چوں کہ اس بات کا خطرہ ہر وقت موجود رہتا ہے کہ اجتہاد کی عام اجازت سے کہیں ہر کس و ناکس اس میدان میں اپنے افکار و خیالات کے گھوڑے نہ دوڑانے لگے، اس لیے علماء نے اس کی کڑی شرائط متعین کی ہیں۔ جو شخص ان شرائط پر پورا اترے گا وہی اجتہاد کرنے کا اہل ہوگا۔ وہ شرائط درج ذیل ہیں:

(۱) وہ عربی زبان کا عالم ہو۔ چوں کہ قرآن و سنت فصیح و بلیغ عربی زبان میں ہیں،

اس لیے ان کے اسلوب، حقیقت ومجاز، تشبیہ وغیرہ کا علم ضروری ہے۔ امام شافعیؒ اس سے ایک قدم اور آگے بڑھ کر فرماتے ہیں کہ عربی زبان کا علم حاصل کرنا ہر مسلمان پر ضروری ہے، تاکہ اس کے دین میں درستگی پیدا ہو سکے۔ اگر مجتہد کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ علومِ عربیہ کا متبحر عالم ہو تو عامی کے لیے کم از کم اتنا لازم ہے کہ قرآن کی تلاوت کر سکے اور اجمالی طور پر اس کے مطالب سمجھ سکے۔

(۲) قرآن مجید کا اتنا علم رکھتا ہو کہ اس کے لیے اجتہاد کرنا ممکن ہو۔ اسے احکام کی تمام آیات کا علم ہو، ان کے اسبابِ نزول سے کما حقہ واقف ہو۔ امام شافعیؒ کے نزدیک پورے قرآن مجید کا حافظ ہونا بھی ایک شرط ہے، لیکن عام علماء اسے بطور شرط بیان نہیں کرتے۔

(۳) سنت کا علم، طریقِ روایت، روایت کے درجے، راویوں کے مراتب، احادیثِ احکام اور جن مواقع پر وہ احادیث بیان کی گئی ہیں، ان تمام باتوں سے واقف ہو۔

(۴) ان احکام کا اسے علم ہو جن پر صحابہ کا اجماع ہے۔ اسی طرح فقہاء کے اقوال سے وہ نہ صرف پوری طرح واقف ہو، بلکہ ان میں اسے مہارت حاصل ہو اور ان کے درمیان موازنہ کرنے کی بھی اس میں صلاحیت ہو۔

(۵) فقہی قیاس کے قوانین اور ان قواعد وضوابط کا علم ہو جن پر چل کر صحابہ، تابعین، ائمہ مجتہدین نے قیاس کے ذریعہ استخراجِ احکام کا کام کیا۔

(۶) شریعتِ اسلامیہ کے عام مقاصد اور مصالح کی اسے معرفت حاصل ہو، جن کا اعتبار اسلام نے کیا ہے نیز جن پر احکام کی بنیاد رکھی ہے۔[۷]

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ (۱۷۰۳-۱۷۶۲ئ) اجتہاد کی شرائط کے حوالہ سے فرماتے ہیں:

''مجتہد وہ ہے جو پانچ علوم کا ماہر ہو:

۱۔ کتاب اللہ کا وسیع علم رکھتا ہو۔

۲۔ سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا وسیع علم رکھتا ہو۔

۳۔ علمائے سلف نے جو کچھ لکھا ہے اس سے آگہی ہو۔

۴۔ قیاس کے طریقۂ کار کو جانتا ہو۔

۵۔ عربی لغت میں مہارت رکھتا ہو'۔۸؎

دور حاضر میں مجتہد کو چاہئے کہ وہ مختلف مسالک کے فروعی مسائل کو باہم قریب کرنے کی کوشش کرے اور جملہ مسالک میں بنیادی حقائق تلاش کرے۔ چنانچہ اگر کسی نے ان مسالک میں کوئی شے نظر انداز کردی ہے، مگر زمانہ اس کا محتاج ہے تو وہ اسے پیش نظر رکھتے ہوئے اپنی رائے کا اظہار کرے۔ اس طریقہ سے کیا گیا اجتہاد نہ صرف عظیم الشان ہوگا، بلکہ اپنی وسعت اور تنوع کے باوصف دیرپا اور قابلِ عمل بھی ہوگا۔

مواقعِ اجتہاد

ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اجتہاد کن مواقع پر کیا جائے گا؟ علمائے کرام نے اس سوال کا بھی جواب دیا ہے:

(۱) اجتہاد ان احکام ومسائل میں ہو جن میں فقہاء پہلے غور وفکر کرچکے ہیں۔

(۲) ان احکام ومسائل میں ہو جو پہلے سے موجود نہ ہوں، بلکہ حالات وتقاضے کے مطابق اب ان کی ضرورت پیش آرہی ہو۔

(۳) اجتہاد سابق فقہاء کی رائے کے موافق ہو۔

(۴) بنیاد میں اتفاق کے باوجود مختلف وجوہ کی بنا پر آراء مختلف ہوئی ہوں۔

(۵) اجتہاد شورائی طرز کا ہو کہ آپس میں ایک دوسرے کی اعانت ومدد سے کسی نتیجہ پر پہنچا گیا ہو۔

(۶) انفرادی اجتہاد ہوا اور اس میں قلبی طمانینت حاصل ہوئی ہو۔

(۷) اجتہاد موقع ومحل کی تعیین کے لیے ہو۔

(۸) اجتہاد مختلف اقوال میں حالات کے لحاظ سے ترجیحی صورت پیدا کرنے کے لیے ہو۔

(۹) حکم شرعی کا اصل مقصد فوت ہورہا ہے، اس کو واپس لانے کی غرض سے حکم کا نیا قالب تیار کرنے کے لیے اجتہاد کیا گیا ہو۔

(۱۰) حالات کی تبدیلی کی بنا پر اصل حکم میں مشقت ودشواری پیش آرہی ہے یا مضرت کا یقین ہے تو سہولت پیدا کرنے کے یا دفعِ مضرت کے لیے اجتہاد ہو۔۹؎

اجتہاد ایک ناگزیر عمل ہے۔ ایک زندہ اور تحرک پذیر معاشرہ، جو اسلام کی راہ نمائی میں زندگی کے نظام کو جاری رکھنا چاہتا ہے، اس کے لیے اجتہاد کا دروازہ کبھی بند نہیں کیا جا سکتا۔ واضح رہے کہ اجتہاد اسلام کے دعویٰ کے ساتھ اس کے احکام اور اس کے مقاصد سے فرار کا نام نہیں ہے۔ اجتہاد دین اور ایمان کے معاملہ میں معذرت خواہی اور احساس کم تری کا نام بھی نہیں ہے۔ اجتہاد اسلام کو موم کی ناک بنانے کا نام بھی نہیں ہے کہ دنیا میں غالب ہونے والے کسی گم راہ فلسفے یا شیطانی فکر سے مرعوب ہو کر اسلامی احکام کی تعبیر و تشریح اس کے مطابق کرنے کی کوشش کی جائے۔ اجتہاد مغربی فلسفوں اور تہذیب کے استیلاء اور غلبے سے متاثر ہو کر سرمایہ داری اور کمیونزم کے فلسفوں سے اسلام کو آلودہ کرنے کا نام بھی نہیں ہے، بلکہ اجتہاد کی اصل روح یہ ہے کہ انسانی زندگی کا کوئی بھی گوشہ اور کوئی بھی عمل اسلام کی روشنی اور رہ نمائی سے محروم نہ رہے۔

اجتہاد کو بنیادی طور پر چار ادوار میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

(۱) عہدِ نبوی (۲) عہدِ صحابہ

(۳) عہدِ تابعین (۴) عہدِ ائمہ مجتہدین

عہدِ نبوی میں اجتہاد

اجتہاد کا آغاز نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عہد ہی سے ہو گیا تھا۔ صحابہ کرام کو دورانِ سفر بعض ایسے امور سے سابقہ پیش آتا جن سے متعلق شرعی نصوص کا انہیں علم نہ ہوتا تو وہ اجتہاد کر لیتے اور سفر سے واپسی کے بعد نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنا اجتہاد پیش کرتے۔ آپؐ یا تو اسے برقرار رکھتے یا پھر اس کی تصحیح کر دیتے۔ ایسا بھی ہوا کہ آپؐ نے ان امور میں جن کے بارے میں وحی خاموش تھی، صحابۂ کرام سے مشورہ کیا۔ جیسا کہ آپؐ نے غزوۂ بدر کے قیدیوں کے بارے میں مشورہ کیا تھا۔ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ دونوں نے اجتہاد فرمایا۔ آپؐ نے حضرت ابوبکرؓ کا اجتہاد قبول کر کے اسے نافذ کر دیا۔ لیکن آپؐ کو اس فیصلہ کے درست نہ ہونے کی اطلاع وحی کے ذریعہ کر دی گئی۔[۱۰] اسی طرح اذان

کے معاملہ میں بھی باقاعدہ مشاورت کی گئی اور صحابہ کرامؓ کے اجتہادات کی روشنی میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے وہ طریقہ پسند فرمایا جو آج تک چلا آرہا ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اجتہادی مشاورت بالکل عمومی نوعیت کی نہیں ہوا کرتی تھی، بلکہ چیدہ اور منتخب لوگوں کو آپؐ اس باب میں اجازت مرحمت فرماتے تھے۔ عبدالصمد صارم تحریر فرماتے ہیں:

> ''بعض مسائل و معاملات کے متعلق حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خود حکم دیتے تھے، بعض میں صحابہ کرامؓ سے مشورہ فرماتے تھے۔ جیسے اذان کے معاملہ میں یا اسیرانِ جنگ بدر کے معاملہ میں شوریٰ کی..... ہر صحابی کے لیے نہ تھی، بلکہ ان حضرات سے مشورہ کیا جاتا تھا جن کا علم و عقل اور تجربہ وسیع تھا، حاضر باشی یا تقویٰ وطہارت پر ہی اس کا انحصار نہ تھا۔ جب مسلمانوں کی تعداد بڑھ گئی اور اکثر اصحاب صحبتِ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اچھی طرح مستفید ہوئے تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بعض صحابہ کو اجتہاد وفتویٰ کا مجاز قرار دیا۔''[۱۱]

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اجتہادی دور میں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ آپؐ نے نہ صرف خود متعدد موقعوں پر اجتہاد کیا، بلکہ اس عمل کو مستحسن جانتے ہوئے اجتہاد کرنے والے اور اس عمل میں سہواً غلطی کرنے والے کو بھی اجر کا مستحق قرار دیا۔ چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے:

> **اذا حکم الحاکم فاجتهد ثم أصاب فله أجران و اذا حکم فاجتهد ثم أخطأ فله أجر۔** [۱۲]
>
> ''اگر کوئی قاضی اپنے اجتہاد سے کوئی فیصلہ کرے اور وہ درست ہو تو اس کے لیے دو اجر ہیں (ایک صحیح ہونے کا، دوسرا اجتہاد کا) اور اگر غلط فیصلہ کرے تو ایک اجر ہے۔''

صحیح فیصلہ پر دوگنے ثواب کی بات تو سمجھ میں آتی ہے، لیکن غلطی کرنے پر بھی اجر کا ملنا سمجھ سے بالاتر ہے۔ شیخ ابوزہرہؒ نے اس کی وضاحت ان الفاظ میں کی ہے:

''شریعت اسلامیہ میں مجتہد مخطی پر کوئی گناہ نہیں، کیوں کہ ایسا کرنے سے ہوسکتا تھا کہ علماء اجتہاد کرنا ہی ترک کردیں۔'' ۱۳؎

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو خاص طور پر اجتہاد کی اجازت مرحمت فرمائی تھی۔ مولانا محمد متین ہاشمی لکھتے ہیں:

''یہ شواہد بھی موجود ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بعض صحابہ رضی اللہ عنہم کو عہدِ نبوی میں اجتہاد کرنے کی اجازت مرحمت فرمائی۔ ان میں جلیل القدر صحابی خلیفہ راشد حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا نام سرفہرست ہے۔ بقول ڈاکٹر حمید اللہ رسولِ خدا نے اپنی زندگی میں ان کو مدینہ منورہ میں مفتی مقرر فرمایا تھا کہ جس کسی کو کسی مسئلہ کے متعلق قانون اسلام دریافت کرنا ہو عام طور سے انہی سے رجوع کریں اور یہ وہ واحد شخص ہیں جو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی موجودگی میں فتویٰ دیتے تھے۔'' ۱۴؎

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جب حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو یمن کا گورنر بنا کر بھیجا تو ان سے دریافت فرمایا: جب کوئی مقدمہ تمہارے سامنے پیش ہوگا تو کیسے فیصلہ کرو گے؟ انھوں نے جواب دیا: جیسا کتاب اللہ میں ہے اس کے مطابق فیصلہ کروں گا۔ پھر سوال کیا کہ اگر کتاب اللہ میں صراحت کے ساتھ ذکر نہ ہوتو پھر کیسے فیصلہ کرو گے؟ جواب دیا: پھر سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مطابق فیصلہ کروں گا۔ پھر سوال کیا کہ اگر سنت میں بھی صراحت کے ساتھ ذکر نہ ہو پھر کیسے فیصلہ کرو گے؟ جواب دیا: اگر ایسی حالت ہوئی تو میں اپنی رائے سے اجتہاد کر کے فیصلہ کروں گا۔ اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خوش ہوئے اور فرمایا:

الحمد للہ الذی وفق رسول رسول اللہ لما یرضی رسول اللہ ۱۵؎

اللہ کا شکر ہے کہ اس نے اپنے فرستادہ (رسول) کے فرستادہ کو صحیح بات کی توفیق دی جو اس کے رسول کو پسند ہے۔''

احادیثِ نبوی سے ثابت ہوتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے متعدد مواقع پر اجتہاد سے کام لیا ہے۔ مثلاً:

(۱) بلّی کے جھوٹے سے متعلق آپؐ سے دریافت فرمایا گیا تو آپؐ نے فرمایا: ''یہ حرام نہیں ہے''۔اس کی علّت یہ بیان کی کہ یہ لوگوں کے گھروں میں کثرت سے آتی جاتی ہے۔۱۶؎

(۲) آپؐ نے ابتداء میں قربانی کے گوشت کو ذخیرہ کرنے سے منع فرمایا، لیکن بعد میں اس کی اجازت دے دی۔۱۷؎

(۳) قبیلۂ خشعم کی ایک عورت نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے دریافت فرمایا کہ میرے والد بہت زیادہ بوڑھے ہوگئے ہیں (وہ ارکانِ حج ادا نہیں کر پائیں گے) کیا میں ان کی طرف سے حج کرسکتی ہوں؟ آپؐ نے اسے اس کی اجازت دی۔۱۸؎

(۴) حضرت عمرؓ نے روزہ کی حالت میں اپنی اہلیہ کا بوسہ لے لیا۔انھوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے دریافت کیا کہ کیا ایسا کرنے سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے؟ آپؐ نے فرمایا: ''کیا پانی منہ میں لینے سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے''۔۱۹؎

اجتہاد عہدِ صحابہ میں

اس میں کوئی شک نہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دور میں اجتہاد بہت کم ہوا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وحی الٰہی کا سلسلہ ابھی منقطع نہیں ہوا تھا۔لیکن جتنا اجتہاد ہوا وہ اس لیے تھا کہ صحابہ کرامؓ کو اس کی رغبت دلائی جائے اور انہیں پیش آمدہ مسائل سے نمٹنے کا عادی بنایا جائے، تاکہ وہ جدید مسائل میں شرعی نصوص سے استفادہ کرتے ہوئے امت کی بہتر طور پر رہ نمائی کرسکیں۔

صحابہ کی پوری جماعت اہلِ فتویٰ نہ تھی اور نہ شرعی و دینی امور میں سب کو مراجعت حاصل تھی، بلکہ افتاء کا منصب صرف حفّاظ کے لیے مخصوص تھا۔اس گروہ کو قرآن کے ناسخ ومنسوخ، محکم ومتشابہہ اور جملہ دلالات وعلل پر گہری نظر حاصل تھی۔کیوں کہ اس نے براہ راست چشمۂ رسالت سے اکتسابِ فیض کیا تھا یا اجلّۂ صحابہ سے قرآن کی روشنی اخذ کی تھی۔اس گروہ کو 'قرّائ' کے لقب سے پکارا جاتا تھا، یعنی قرآن پڑھنے اور سمجھنے والے۔ پھر جب اسلامی سلطنت کی حدود دور دور تک پھیل گئیں تو کتاب و سنت کے

چرچے نے عرب سے ناخواندگی اور جہالت کی تاریکی کافور کردی۔ قریہ قریہ اجتہاد و استنباط کی روشنی ظہور میں آئی ۔جو لوگ مقدمات و نزاعات کے فیصلے کے لیے قاضی اور جج کی حیثیت سے مقرر کیے جاتے تھے وہ براہ راست قرآن وحدیث سے رہ نمائی حاصل کرتے تھے۔صحابہ کرامؓ کے اجتہاد کے متعلق مولانا محمد تقی امینیؒ فرماتے ہیں:

''صحابہ کرامؓ کے زمانہ میں جب فتوحات کی کثرت ہوئی اور مختلف تمدنی زندگی سے سابقہ پڑا تو نئے نئے اجتماعی و سیاسی مسائل ابھر آئے ،جن کو حل کیے بغیر معاشرہ کی رہ نمائی کی کوئی شکل نہ تھی ۔''۲۰؎

چنانچہ صحابہ کرامؓ نے اجتہاد سے بھرپور فائدہ اٹھایا اور پیش آمدہ مسائل کا حل تجویز کرنے میں انھوں نے کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ حضرت عمرؓ نے قاضی شریح کو خط لکھا تھا کہ ''جو واقعہ تمھیں پیش آئے اور اس کا حکم قرآن وسنت میں نہ ہو تو اس پر خوب سوچو اور اس کو پوری طرح سمجھنے کی کوشش کرو۔ پھر ایک معاملہ کو دوسرے معاملہ پر قیاس کرو، معاملات کو مختلف نظریوں سے پہچانو، پھر جو تمہاری رائے میں اللہ تعالیٰ کو زیادہ پسندیدہ ہو اور حق کے قریب ہو اس پر اعتبار کرو''۔۲۱؎

اسی طرح انھوں نے حضرت ابوموسیٰ الاشعریؓ کو ایک خط میں لکھا:

''جو فیصلہ تم نے آج کیا، پھر تم نے اس فیصلے سے رجوع کرتے ہوئے اپنی صائب رائے سے صحیح فیصلہ کرلیا تو اپنے سابق فیصلے کو چھوڑ کر حق کی طرف رجوع کرنے میں دریغ نہ کرو۔ کیونکہ حق قائم ودائم رہتا ہے اور کوئی شئے اسے حق ہونے سے نہیں روک سکتی۔ لہٰذا حق کی طرف رجوع کرنا زیادہ عرصہ باطل پر رہنے سے بہتر ہے۔''۲۲؎

عہدِ صحابہ میں اجتہاد کی متعدد مثالیں ملتی ہیں:

(۱) حضرت ابوبکر صدیقؓ نے مانعینِ زکوٰۃ کی سرکوبی کے لیے فوج روانہ کرنے کا ارادہ فرمایا تو بعض صحابہ کرامؓ نے ،جن میں حضرت عمرؓ بھی شامل تھے، آپ کے اس عمل کی مخالفت کی ۔ان کی دلیل نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ قول تھا کہ جس نے کلمہ لا الہ الا اللہ

پڑھ لیا اس کی جان اور اس کا مال محفوظ ہوگیا۔مگر حضرت صدیقؓ کی نظر اس حکم کے دوسرے پہلو پر بھی تھی۔انہوں نے اس دلیل کا جواب اسی دلیل سے یہ دیا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کے ساتھ یہ بھی تو فرمادیا تھا کہ ''الاّ بحقّ الاسلام''۲۳۔چنانچہ انہوں نے مانعین زکوٰۃ کے خلاف جہاد کیا۔

(۲) نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے انتقال کے بعد سماجی زندگی میں صحابہ کرامؓ کو غالباً سب سے اہم مسئلہ زمین کی تنظیم وتقسیم کا پیش آیا۔چنانچہ عراق وشام فتح ہونے کے بعد زمین کی تنظیم وتقسیم کے معاملے میں ان کے درمیان اختلاف ہوا۔ایک گروہ کی رائے یہ تھی کہ زمین فوجیوں میں تقسیم کردی جائے۔اس میں حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ اور حضرت بلالؓ وغیرہ شامل تھے۔دوسرے گروہ کی رائے تھی کہ زمین اصل باشندوں کے پاس رہنے دی جائے۔اس میں حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت طلحہؓ، حضرت معاذ بن جبلؓ وغیرہ تھے۔۲۴۔اس وقت حضرت عمرؓ کا دورِ خلافت تھا۔انہوں نے صحابہ کرامؓ کو اپنے موقف پر قائل کیا اور اجتہاد کرتے ہوئے زمینوں کو ان کے اصل مالکوں کے پاس ہی رہنے دیا۔

(۳) حضرت عمرؓ نے قحط کے زمانہ میں چوروں کی سزا ملتوی کردی تھی۔۲۵۔

(۴) نماز تراویح کی بیس رکعات کا حکم حضرت عمرؓ کا اجتہادی فیصلہ تھا۔(۲۶)

ایک طرف تو صحابہ کرامؓ نے اجتہاد کے ذریعے بہت سے مسائل کا حل دریافت کیا، دوسری طرف وہ اس عمل میں حد درجہ احتیاط برتتے تھے۔نیز اپنے عمل کو حجت قرار نہیں دیتے تھے، بلکہ اپنے پیش کردہ اجتہاد سے عمدہ اجتہاد مل جانے پر اپنے اجتہاد کو چھوڑ دیتے تھے۔چنانچہ حضرت ابوبکر صدیقؓ سے 'کلالہ' کی وراثت کے متعلق پوچھا گیا تو انھوں نے مسئلہ بیان کرنے کے بعد فرمایا:

أقول فیھا برائ، فان یکن صواباً فمن اللّٰہ و ان یکن خطأً فمنّی و من الشیطان۔۲۷۔

''میں اپنی رائے سے بات کہتا ہوں۔اگر وہ صحیح ہے تو اللہ کی طرف

سے ہے اور اگر غلط ہے تو میری اور شیطان کی طرف سے ہے۔''

اسی طرح حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے عورت کے طلاق لینے کے اختیار کے متعلق فرمایا:

أجتهد فيها برائ، ان اصبت فمن اللّٰہ و إن أخطات فمنّی و من الشيطان۔۲۸؎

''میں اپنی رائے سے فتویٰ دیتا ہوں۔ اگر وہ درست ہے تو اللہ کی طرف سے ہے اور اگر غلط ہے تو میری اور شیطان کی طرف سے ہے۔''

تابعین کا دورِ اجتہاد

تمدن کی وسعت، فتوحات کی کثرت اور علمی ترقی کی وجہ سے صحابہؓ کے مقابلے میں تابعین کو اجتہاد کی زیادہ ضرورت پیش آئی۔ چنانچہ انہوں نے اجتہاد کے دائرہ کو زیادہ وسیع کیا۔ اس کے لیے انہوں نے درج ذیل تین بنیادی کام کیے:

(۱) حکومتی سطح پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی احادیث کو جمع کیا۔

(۲) صحابہ کرامؓ کے اقوال وفتاویٰ اور ان کے اجتہادات کی شیرازہ بندی کی۔

(۳) اجتہاد کے ذوق کو علمی رنگ دیا۔۲۹؎

تابعین کے دور میں اجتہاد کے لیے تین قسم کے مسائل متعین ہوئے:

(۱) وہ نئے مسائل جو تمدن کی وسعت، فتوحات کی کثرت اور علمی ترقی کی وجہ سے پیدا ہوئے۔

(۲) وہ مسائل جن پر پہلے اجتہاد ہو چکا تھا اور اب حالات وظروف کی تبدیلی سے ان کا مقصد فوت ہو رہا تھا یا ان پر عمل درآمد سے لوگوں کو غیر معمولی مشقت پیش آ رہی تھی۔

(۳) وہ مسائل جن کا ذکر نص میں موجود تھا، لیکن زمانی مصلحت کی وجہ سے صحابہؓ نے ان کے نفاذ کا موقع ومحل متعین کیا تھا۔۳۰؎

یہ بنوامیہ کا دور تھا۔ اس دور میں مسلمانوں نے دیگر علوم وفنون کی بھی داغ بیل ڈالی اور اسی دور میں اجتہاد کا دائرہ صحابہ کرامؓ کے دور کی بانسبت زیادہ وسیع ہوا۔

ڈاکٹر جمال الدین عطیہ لکھتے ہیں:

''جب ہم تابعین کے دور کا مطالعہ کرتے ہیں تو یہ محسوس کرتے ہیں کہ تابعین کے دور میں اجتہاد و استنباط کا دائرہ وسیع ہوجاتا ہے۔ ایک تو اس لیے کہ نئے نئے واقعات کی کثرت ہوگئی، دوسرے اس لیے بھی کہ تابعین کی ایک جماعت فتویٰ کے لیے گویا وقف ہوگئی تھی۔ ان حضرات کے سامنے تین مصادر تھے: کتاب اللہ، سنت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور صحابہؓ کے فتاویٰ۔ ان میں سے بعض وہ حضرات تھے جو نص نہ موجود ہونے کی صورت میں مصلحتِ شرعی کو بنیاد بنا کر حکمِ شرعی کا استنباط کرتے تھے اور بعض دیگر حضرات قیاس کی راہ اپناتے تھے۔''۳۱؎

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے تربیت یافتہ صحابہ کرامؓ اجتہاد کے حوالہ سے حد درجہ احتیاط کرتے تھے، نیز اس دور میں اسلامی سلطنت کی حدود زیادہ نہ پھیلی تھیں، لیکن تابعین کے دور میں ان میں نہ صرف اضافہ ہوا، بلکہ استحکام بھی حاصل ہوا۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ مسلمانوں کو نئے نئے مسائل سے دوچار ہونا پڑا، چنانچہ انھیں اپنی رائے سے اجتہاد کرنا پڑا۔

اس دور کا سب سے اہم کارنامہ احادیثِ نبوی کی باقاعدہ تدوین تھا۔ حکومتی سطح پر احادیث جمع کرنے کی طرف سب سے پہلے حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے توجہ دی۔ انھوں نے مدینہ اور دیگر علاقوں کے حکام اور کبار علماء کو اس سلسلے میں خطوط لکھے اور نہایت محنت وجاں فشانی کے ساتھ یہ کام پایہ تکمیل کو پہنچا۔ ۳۲؎ اس طرح اس دور کے فقہاء کو احادیثِ مبارکہ کا ایسا عظیم الشان ذخیرہ میسّر آ گیا جس سے اجتہاد کے مراحل نسبتاً آسان ہو گئے۔

ائمہ مجتہدین کا اجتہادی دور

ائمہ مجتہدین کا دور اجتہاد کا زریں دور تھا۔ اس دور میں اجتہاد سے بہت زیادہ کام لیا گیا اور فقہاء نے اس کے اصول مدوّن کیے۔ اس دور میں چوں کہ بہت سی نئی قومیں حلقہ بگوشِ اسلام ہوئیں، اس لیے ان کی عادات، خصائل اور رسم و رواج کی وجہ

سے کئی پیچیدگیاں پیدا ہوئیں۔ مولانا محمد تقی امینیؒ لکھتے ہیں:

''ان لوگوں کے اختلاط سے اسلامی معاشرہ میں ایک عجیب کش مکش پیدا ہوئی اور ان کے ساتھ معاملات نے بہت سے نئے مسائل پیدا کیے۔ نیز حالات کی تبدیلی سے بعض قدیم مسائل کے موقع و محل متعین کرنے کی ضرورت پیش آئی۔ ائمہ مجتہدین کو اللہ کروٹ کروٹ چین نصیب کرے کہ انہوں نے نہ صرف وقتی اور زمانی حالات کا مقابلہ کیا، بلکہ اجتہاد کے ایسے زرّیں اصول وضع کیے کہ ان کے ذریعہ ہر دور و زمانہ میں نمو پذیر زندگی اور ترقی پذیر معاشرہ کی رہ نمائی آسان ہوگئی۔''۳۳؎

دوسری صدی ہجری میں اسلامی فقہ کے چار عظیم مکاتبِ فکر ابھرے۔ ان کے ائمہ نے انفرادی اور اجتماعی زندگی کے اکثر معاملات میں اجتہاد کے ذریعے بہت سے اصول وضع کیے۔ اگرچہ ان فقہی مکاتب کے رہ نما اسلامی شرع کی تاریخ میں اختلاف رائے کا سبب رہے، تاہم ان کے بعد اجتہاد کا دروازہ بند ہونے سے اسلامی فکر کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا۔

چونکہ اسلامی فقہ انسانی زندگی کے جملہ پہلوؤں سے بحث کرتی ہے، اس لیے اس کا دائرہ کار بہت وسیع ہے۔ چنانچہ مسائل جدیدہ کے حل کے لیے مجتہدین نے قیاس، استحسان، استصلاح اور استدلال کے طریقے اپنائے، جو اجتہاد ہی کی اقسام ہیں۔ چنانچہ اس دور میں مجتہد کا درجہ صرف اسی شخص کو حاصل ہوتا تھا جو ان جملہ علوم کا ماہر ہو اور ان سے استفادہ کرتے ہوئے آزادانہ طور پر کسی فیصلہ پر پہنچنے کی مکمل صلاحیت رکھتا ہو۔ اگرچہ اس دور میں بہت سے ائمہ نے اجتہاد کیا، مگر ان میں سے ائمۂ اربعہ (امام ابوحنیفہ، امام مالک، امام شافعی اور امام احمد بن حنبل رحمہم اللہ) کو زیادہ شہرت نصیب ہوئی۔

ان فقہاء کے مسالک کو دوام حاصل ہوا اور امت کے کثیر طبقہ نے ان پر اعتماد کرتے ہوئے ان کے اجتہادات کو تسلیم کیا۔ ایک طرف تو ان ائمہ نے امت پر احسان کرتے ہوئے لاکھوں مسائل مدوّن کر دیے تو دوسری طرف وہ اس حوالہ سے انتہائی حزم

و احتیاط سے کام لیتے رہے۔ امام ابوحنیفہؒ فرماتے تھے: ''جب کتاب اللہ اور سنتِ رسول میں کوئی مسئلہ مجھے نہیں ملتا تو جس صحابی کا قول چاہتا ہوں لے لیتا ہوں، جس کا چاہتا ہوں چھوڑ دیتا ہوں۔ پھر ان کے دائرہ اقوال سے نکل کر کسی دوسرے قول کی طرف رجوع نہیں کرتا۔ یہاں تک کہ معاملہ ابراہیم شعبی، حسن، ابن سیرین اور سعید بن مسیب پر پہنچتا ہے تو مجھے بھی حق ہے کہ جیسے وہ اجتہاد کرتے تھے میں بھی کروں۔'' اسی طرح امام مالکؒ کے متعلق منقول ہے کہ ان سے جب کوئی فتویٰ پوچھا جاتا تو وہ اس کا جواب اس طرح ڈرتے ہوئے دیتے تھے گویا وہ جنت اور دوزخ کے درمیان کھڑے ہوں۔ امام ابوحنیفہؒ نے قرآن و حدیث کے بعد اجتہاد کو اہمیت دی، اس کے برعکس امام مالکؒ کا زیادہ زور اہل مدینہ کی رائے کی طرف رہا، جب کہ امام شافعیؒ نے ان دونوں کی درمیانی راہ اپنائی۔ انہوں نے دیکھا کہ صحابہ کرام و تابعین عظام اور ائمہ مجتہدین سے منقول ایک بڑا فقہی ذخیرہ موجود ہے۔ ایک طرف انھوں نے مدینہ کے فقہی علوم امام مالکؒ سے حاصل کیے، دوسری جانب امام محمدؒ سے عراق کے فقہی ذخیرہ کو اخذ کیا، تیسری طرف مکہ مکرمہ میں نشوونما اور سکونت کی بنا پر وہاں کے فقہی علوم حاصل کیے۔ اس طرح تینوں فقہی سکولوں سے کسب فیض کے ساتھ ان فقہی مناقشات نے ان کے ذہن کو اس طرف متوجہ کیا کہ کچھ قواعد وضع کریں جن سے اجتہاد میں خطا وصواب کا پتہ چل سکے۔ یہی قواعد آج اصولِ فقہ کے نام سے معروف ہیں۔ ۳۴؎

امام ابوحنیفہؒ کی اجتہادی بصیرت کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ وہ انسانی فطرت سے قریب تر ہے۔ انھوں نے مختلف حالات و واقعات کے تناظر میں رونما ہونے والے مسائل کو انتہائی سہل انداز میں پیش کیا ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ان کی فقہ کو جو شہرت نصیب ہوئی وہ دیگر کسی فقہ کو حاصل نہ ہوئی۔ امام ابوحنیفہؒ نے ایک طرف اجتہاد کے ذریعہ فقہ اسلامی کے مسائل کو حل کرنے کی سعی کی تو دوسری طرف وہ اپنے ناقدین کی تنقید سے بھی نہ بچ سکے جو اس حکم کے نفاذ کو غیر ضروری قرار دیتے تھے۔

بہرحال تابعین کے عہد کے بعد جب ہم مجتہدین کے عہد کا مطالعہ کرتے ہیں

تو یہ بات محسوس ہوتی ہے کہ یہ مناہج تابعین کے عہد کے مقابلہ میں زیادہ واضح شکل میں ایک دوسرے سے ممتاز ہوجاتے ہیں اور مناہج استنباط کے متمیز ہونے کے ساتھ استنباط کے قوانین اور اس کی علامتیں نہایت اجاگر ہوجاتی ہیں اور ائمہ مجتہدین کی زبانوں پر صریح، واضح اور فنی عبارتوں میں یہ مناہج اور قوانین واشگاف ہوتے ہیں۔ ۳۵؎

اگرچہ ائمہ مجتہدین کے اجتہاد نے باہمی اختلافات کی فضا قائم کی، لیکن یہ ایک فطری عمل ہے کہ جب کوئی نئی چیز دریافت کی جاتی ہے تو اس میں باہمی اختلافات کوئی انوکھی چیز نہیں سمجھی جاتی۔ اجتہاد میں رائے کے اختلاف کی اہمیت مسلّم ہے اور اس سے قوت استدلال کے ذریعہ مسائل پر غور وخوض کرنے میں مدد ملتی ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ صحابہ کرامؓ میں بھی بعض اجتہادی مسائل میں اختلاف ہوا ہے۔ ائمہ مجتہدین کا یہ اختلاف کبھی اصول پر نہیں ہوا، بلکہ ہمیشہ فروع میں ہوا ہے۔ اس اختلاف کا ایک فائدہ یہ ہوا کہ آج ہمارے پاس فقہ اسلامی کا جس قدر ذخیرہ موجود ہے وہ شاید اس کے بغیر ممکن نہ ہوتا۔

حواشی ومراجع

۱؎ امینی، محمد تقی، اجتہاد، قدیمی کتب خانہ کراچی، س ن، ص ۲۱

۲؎ محمد ابو زہرہ، اسلامی قانون اور اجتہاد، چراغ راہ (اسلامی قانون نمبر)، دفتر چراغ راہ کراچی، ج ۲، ص ۱۵۰

۳؎ صبحی محمصانی، فلسفۂ شریعت اسلام، مجلس ترقی ادب لاہور، ۱۹۷۰ئ، ص ۲۱۳

۴؎ گوہر رحمن، اجتہاد اور اوصافِ مجتہد، حرا پبلی کیشنز لاہور، ۱۹۹۰ئ، ص ۲۰

۵؎ محمود احمد غازی، محاضراتِ فقہ، الفیصل ناشران وتاجران کتب لاہور، ۲۰۰۵ئ، ص ۳۳۱-۳۳۲

۶؎ قاسمی، مجاہد الاسلام، اسلامی عدالت، ادارۃ القرآن والعلوم الاسلامیۃ کراچی، ۱۹۹۳ئ، ص ۸۰

۷؎ محمد ابوزہرہ، اسلامی قانون اور اجتہاد، ج ۲، ص ۱۵۵

۸؎ دہلوی، شاہ ولی اللہ، عقد الجید فی احکام الاجتہاد والتقلید، شریعہ اکیڈمی، بین الاقوامی اسلامی یونی ورسٹی، اسلام آباد، ۲۰۰۰ئ، ص ۴۶-۴۷

۹؎ حوالہ سابق

۱۰۔ محمد ابوزہرہ، اسلامی قانون اور اجتہاد، ج ۲، ص ۱۵۰

۱۱۔ صارم، عبدالصمد، تاریخ الفقہ، مکتبہ معین الادب، لاہور، ۱۹۸۴ئ، ص ۲۰

۱۲ صحیح بخاری، کتاب الاعتصام، باب اجر الحاکم۔۔۔، ۷۳۵۲، صحیح مسلم، ۱۷۱۶

۱۳۔ محمد ابوزہرہ، اسلامی قانون اور اجتہاد، ج ۲، ص ۱۵۱۔۱۵۰

۱۴۔ متین ہاشمی، سہ ماہی منہاج (اجتہاد نمبر، ۱۹۸۳ئ)، ص ۱۲۶

۱۵۔ سنن ابو داؤد، کتاب الاقضیۃ، باب اجتہاد الرأی فی القضائ، ۳۵۹۲

۱۶۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الطہارۃ، باب الوضوء بسور الہرۃ، ۳۶۷

۱۷۔ صحیح بخاری، کتاب الاضاحی، باب مایؤکل من لحوم الاضاحی، ۵۵۶۹، صحیح مسلم، ۱۹۷۴ء

۱۸۔ صحیح بخاری، کتاب الحج، باب وجوب الحج، ۱۵۱۳؛ مسلم، ۱۳۳۴

۱۹۔ مسند احمد، ۱/ ۲۸۶

۲۰۔ امینی، محمد تقی، اجتہاد، ص ۴۳

۲۱۔ ابن الجوزیہ، اعلام الموقعین، دار الجیل بیروت، ۱۹۷۳ئ، ج ۱، ص ۶۳

۲۲۔ محمود الحسن عارف، سہ ماہی منہاج (نفاذ شریعت نمبر) ۱۹۸۵ء، ص ۹۷

۲۳۔ ندوی، مجیب اللہ، اجتہاد اور تبدیلی احکام، چراغ راہ (اسلامی قانون نمبر)، ج ۲، ص ۱۷۹

۲۴۔ امینی، محمد تقی، اجتہاد، ص ۴۷

۲۵۔ ندوی، مجیب اللہ، اجتہاد اور تبدیلی احکام، ج ۲، ص ۱۸۲

۲۶۔ ایضاً، ص ۲۱۷

۲۷۔ سنن دارمی، ۲/ ۴۶۲

۲۸۔ ملا جیون، نور الانوار، مکتبہ شرکت علمیہ ملتان، س ن، ص ۲۵۰

۲۹۔ امینی، محمد تقی، اجتہاد، ص ۶۰

۳۰۔ ایضاً، ص ۶۸۔۶۷

۳۱۔ جمال الدین عطیہ، فقہ اسلامی کی نظریہ سازی، الفیصل ناشران وتاجران کتب لاہور، س ن، ص ۱۶

۳۲۔ امینی، محمد تقی، اجتہاد، ص ۶۱

۳۳۔ ایضاً، ص ۶۸

۳۴۔ جمال الدین عطیہ، فقہ اسلامی کی نظریہ سازی، ص ۱۸

۳۵۔ ایضاً، ص ۱۷

☆☆☆

شیخ محمد الغزالیؒ اور ان کی تصنیف فقہ السیرۃ

ایک تعارف

ڈاکٹر صفدر سلطان اصلاحی

شیخ محمد الغزالی عصر حاضر کے معروف عالمِ دین، داعیٔ حق، بلند پایہ مفکر، عظیم قائد، زود نویس، لیکن پختہ مصنف اور محقق تھے۔ انھوں نے جس موضوع پر قلم اٹھایا اس کا حق ادا کر دیا۔ ان کی تحریریں ندرت و ابتکار، علمیت اور اعلیٰ تحقیق کی آئینہ دار ہیں۔ وہ امام حسن البناؒ کے خاص رفقاء میں سے تھے۔ انھوں نے عرصۂ دراز تک اپنے قلم اور زبان سے دعوت وتبلیغ کا فریضہ انجام دیا۔ عالم اسلام اور عالم عرب میں وہ فکر اسلامی کے عظیم معمار، اسلامی بیداری کے سرخیل اور تحریک اسلامی کے سرگرم رہ نما کی حیثیت سے مشہور ہیں۔

شیخ غزالی السّقا، مصر کے ضلع البُحیرہ کے ایک گاؤں میں ۱۹۱۷ء میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے اپنے گاؤں میں قرآن مجید حفظ کیا اور ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ اسکندریہ کے معہد علمی سے ثانوی تعلیم مکمل کرنے کے بعد جامعہ ازہر میں داخلہ لیا اور ۱۹۴۳ء میں ایم اے کی ڈگری حاصل کی۔ انھوں نے بڑی ریاضت اور شوق سے حصول علم کی منزلیں طے کیں اور بہت جلد قدیم و جدید علوم میں سے کئی ایک میں کمال اور غیر معمولی مقام حاصل کرلیا۔ وہ دین کی تبلیغ اور مسلمانوں کی اصلاح کے جذبہ سے سرشار تھے۔ اس لیے مصر اور عالم عرب کی ممتاز اسلامی تحریک 'الاخوان المسلمون' میں شمولیت اختیار کر لی اور اس میں بڑی سرگرمی اور تندہی سے کام کیا۔ وہ بہت اچھے خطیب تھے۔ ان کے خطبات میں دلائل و براہین کے ساتھ ایمانی جذبات کی حدّت اور حرارت بھی

پائی جاتی تھی۔ ان کی تحریروں اور تقریروں سے مصر کے شہروں، قصبوں اور دیہاتوں میں اخوان کی دعوت کے پھیلنے اور عام ہونے میں کافی مدد ملی۔ ان کی طبیعت میں اعتدال، نرمی اور مروّت پائی جاتی تھی، اس لیے وہ غیظ وغضب، اشتعال اور تصادم سے ہمیشہ دور رہے۔ بعض اسباب سے اخوان سے ان کا ضابطہ کا تعلق قائم نہیں رہا، اس کے باوجود انھوں نے دعوت وتبلیغ کا راستہ ترک نہیں کیا، نظام اسلامی کے قیام کے لیے اپنی حد تک کوششیں جاری رکھیں اور ہمیشہ اخوان کی فکر سے متفق اور اس کے رہ نماؤں سے قریب رہے۔ اس کا تذکرہ اخوان کے بعض قائدین نے اپنی یادداشتوں میں کیا ہے۔

انھوں نے اپنے پیچھے بیسیوں وقیع تصانیف اور سیکڑوں مقالات یادگار چھوڑے ہیں۔ انھوں نے تفسیر وحدیث پر بھی لکھا، سیرت وتاریخ پر بھی قلم اٹھایا اور دور حاضر کے فتنوں کا بھی بھرپور تعاقب کیا ہے۔ ان کا پسندیدہ موضوع دعوت اور داعی تھا، اس پر ان کی کئی تصانیف ہیں۔ عورتوں کے مسائل اور ان کے حقوق کے تعلق سے اسلام کی جو تعلیمات ہیں اور ان پر اسلام دشمن طاقتوں اور مغربی ملحدین نے جو اعتراضات کیے ہیں ان پر انھوں نے بہت تفصیل سے اظہار خیال کیا ہے اور اسلامی تعلیمات کی صداقت اور حقانیت کا عقلی ونقلی دلائل سے اثبات کیا ہے۔ وہ ایک وسیع النظر اور کشادہ قلب عالم دین تھے، اس لیے اسلام کے بنیادی اصولوں کی روشنی میں خواتین کو جو آزادی اور حقوق دیے جاسکتے تھے ان کی انھوں نے پرزور وکالت کی ہے۔ ان کی تصانیف میں **عقیدة المسلم، خلق المسلم، الاسلام المفتریٰ علیه، التعصب والتسامح بین المسیحیة والاسلام، قذائف الحق، نظرات فی القرآن، جدّد حیاتک، المرأة فی الاسلام، الأسرة المسلمة وتحدیات العصر، السنة النبویة بین اهل الفقه واهل الحدیث** خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔

شیخ محمد الغزالی نے جامعہ ازہر اور وزارت اوقات میں خدمات سرانجام دیں اور مصر سے باہر مختلف عرب ممالک کی جامعات اور کالجز میں تدریسی خدمات انجام دیں۔ مکہ کی جامعہ ام القریٰ میں بھی استاد رہے اور سعودی عرب کی دیگر جامعات کی

مختلف مجالس میں بطور ممبر شرکت کی۔ قطر کے شریعت کالج کے قیام اور اس کی ترقی میں ان کا بنیادی کردار رہا ہے۔ وہ سات سال تک الجزائر میں مقیم رہے اور وہاں کی معروف یونیورسٹی جامعہ امیر عبدالقادر میں تدریس و رہ نمائی کے فرائض انجام دیتے رہے۔ الجزائر میں اسلامی بیداری کی جو لہر نظر آئی ہے اس میں بلاشبہ الغزالی کا اہم حصہ ہے۔

شیخ غزالی کو آں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات گرامی سے بے پناہ عقیدت اور محبت تھی۔ اس کا اظہار سیرت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ان کی مایہ ناز تالیف 'فقہ السیرۃ' کے مباحث میں جگہ جگہ ہوا ہے۔ اس کی تالیف کے دوران وہ ہمیشہ باوضو رہتے اور لکھتے ہوئے اکثر اشک بار ہو جاتے تھے۔ ان کی دلی آرزو تھی کہ ان کی آخری آرام گاہ مدینہ منورہ میں ہو۔ ان کی پوری زندگی حتّٰی کہ موت بھی قابل رشک تھی۔ وہ زندگی بھر اللہ کے دین کی خدمت میں مصروف رہے۔ موت آئی تو اس نے بھی انھیں On Duty پایا۔ وہ سعودی عرب کے شہر ریاض میں ایک مذاکرہ میں 'اسلام اور مغربی دنیا' کے موضوع پر اظہار خیال کر رہے تھے کہ دل کا شدید دورہ پڑا۔ پھر چند لمحوں میں اپنے مالک حقیقی سے جا ملے۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔ (شیخ غزالی کے احوال زندگی سے متعلق یہ معلومات مجلہ البعث الاسلامی لکھنؤ، جلد ۴۱، شمارہ ۵، ماہ نامہ ترجمان القرآن لاہور، مئی ۱۹۹۶ء اور ویکی پیڈیا سے لی گئی ہیں۔)

فقہ السیرۃ کا اندازِ تالیف

عصر حاضر میں بعض عرب مصنفین نے ایک نئے اور منفرد انداز میں سیرت نگاری کی کوشش کی ہے۔ وہ یہ کہ سیرت نبوی کے اہم اور بڑے واقعات کی مختصر تفصیل پیش کر کے ان سے ماخوذ اور مستنبط دروس و احکام کا اس انداز سے تذکرہ کیا جائے کہ ان کے مطالعہ سے دور حاضر میں زندگی گزارنے کے طور طریق معلوم ہوں اور پیش آمدہ مسائل اور چیلنجز کا حل سامنے آئے۔ چنانچہ عربی زبان میں اس طرح کی کئی کتابیں سامنے آ چکی ہیں۔ ان میں ڈاکٹر مصطفی السباعی کی 'السیرۃ النبویۃ۔ دروس وعبر' اور ڈاکٹر محمد سعید رمضان البوطی کی 'فقہ السیرۃ النبویۃ' خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ محمد الغزالی کی

'فقہ السیرۃ' بھی اسی انداز تالیف کی ایک بہترین کوشش ہے۔ وہ اپنے اس اچھوتے انداز کا تعارف خود اس طرح پیش کرتے ہیں:

''میں نے قارئین کے سامنے سیرتِ رسول کی سچی تصویر پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔عہد نبوی میں جو واقعات پیش آئے، میں نے ان کی تفصیل اور توضیح کے ساتھ ان میں پنہاں مواعظ، نصائح اور پُرحکمت دروس و اسباق بیان کیے ہیں۔ پھر میں نے حقائق کا شرح و بسط سے تذکرہ کرنے کے بعد یہ بات قارئین پر چھوڑ دی ہے کہ وہ ان کے اثرات کس طرح اور کتنے قبول کرتے ہیں''۔ (ص ۴، مقدمہ، مقالہ نگار کے پیش نظر کتاب کا دارالکتب الحدیثۃ مصر کا طبع ہفتم ۱۹۷۶ء رہا ہے۔)

یہ ایک حقیقت ہے کہ سیرت نبوی ایک بحر ناپیدا کنار ہے۔کوئی انسان چاہے کہ اُس کے تمام پہلوؤں، ان کے تمام معانی اور فوائد و برکات کا احاطہ کرلے تو اس میں اسے کبھی کامیابی نہیں مل سکتی۔ البتہ جس بات کی وہ کوشش کرسکتا ہے اور جس میں اسے کامیابی کی توقع ہے وہ یہ کہ سیرت نبوی سے متعلق واقعات کی مدد سے دینی تعلیمات کی روح تک رسائی حاصل کرے اور پھر اسے قارئین کے قلوب و اذہان تک منتقل کرنے کا ہر ممکن طریقہ اور اسلوب اختیار کرے۔

کسی صحیح الفکر اور صحیح العقیدہ مسلم مؤلف کے لیے رسول کریم کی حیات طیبہ سے متعلق واقعات اور احوال میں اپنی طرف سے اضافہ کی گنجائش نہیں ہوتی۔اس کے جوہر اور کمال کا اندازہ ان واقعات کے انتخاب، ان کی ترتیب اور ان کے پیش کرنے کے لیے اختیار کردہ اسلوب سے ہوتا ہے۔اس پہلو سے یہ کتاب محمد الغزالی کے ادب و انشائ، اسلوبِ نگارش، اندازِ فکر و دینی رجحان، مورخانہ بصیرت اور ذوقِ انتخاب کا انتہائی حسین نمونہ ہے۔اس میں مصنف کے قلم کی طہارت، فکر کی پاکیزگی، دل کا سوز اور دینی شغف بہت ابھرا ہوا دکھائی دیتا ہے۔اس کی ایک ایک سطر محبت رسول کی خوشبو میں بسی ہوئی ہے اور ایک ایک ورق عقیدت و الفت کے جواہر سے لبریز ہے۔

ماضی اور حال کے سیرت نگاروں کے سامنے سیرت نگاری کے الگ الگ

طریقے اور مقاصد رہے ہیں۔ بعض نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذاتی زندگی کے احوال و کوائف کی جمع و ترتیب پر اکتفا کیا ہے اور بعض نے آپؐ کی زندگی کے کسی ایک پہلو کو شرح و بسط کے ساتھ پیش کیا ہے۔ بعض نے آپ کو ہر پہلو سے 'انسان کامل' کی حیثیت میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے اور بعض نے اپنی کتابوں میں عقیدت، محبت اور شیفتگی کے عناصر کو اس حد تک غالب کر دیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مافوق البشر ہستی معلوم ہوتے ہیں، لیکن مجموعی طور سے اکثر و بیش تر کتبِ سیرت میں آپؐ سے متعلق اس حقیقت کو پیش کرنے میں کوتاہی ہوئی ہے کہ آپؐ اللہ کے رسول، مہبط وحی اور حاملِ کتابِ الٰہی ہیں۔ آپؐ اللہ تعالیٰ اور اس کے بندوں کے درمیان واسطہ تھے۔ آپؐ نے اس کے پیغام کو ممکنہ حد تک اللہ کے بندوں کے سامنے پیش کیا، اس پر وارد ہونے والے اعتراضات کے جوابات دیے اور ایمان لانے والوں کی تربیت کی۔ آپؐ نے یہ تمام کام اللہ تعالیٰ کی راست نگرانی اور اس کی ہدایت اور راہ نمائی میں انجام دیے۔ محمد الغزالی نے اسی پہلو سے اپنی کتاب کے مباحث اور ابواب کو مرتب کیا ہے۔ وہ اس کی وضاحت اس طرح کرتے ہیں:

> ''قدیم مؤرخین، سیرت رسول کے تذکرہ کے دوران تمام واقعات اور احوال کو، خواہ وہ چھوٹے ہوں یا بڑے، اسناد کی چھان بین کے بعد بیان کر دیتے ہیں۔ یقیناً ان قدیم مجموعہ ہائے سیرت و تاریخ میں بہت سی اہم اور مفید باتیں مذکور ہیں، لیکن ان سے استشہاد اور ان کے اخذ و تذکرہ میں کمال درجے کی مہارت اور احتیاط مطلوب ہے۔ جب کہ جدید مورخین یا سیرت نگار واقعات و احوال کا تجزیہ، تاویل، موازنہ، مقابلہ اور ان کے سیاق و سباق کے تذکرہ پر زیادہ توجہ دیتے ہیں اور ان ہی گوشوں کو ایک دوسرے سے بہتر بنانے پر قانع ہوتے ہیں..... میں نے ان دونوں طرز ہائے تالیف کو ایک نئے انداز میں جمع کر دیا ہے اور ان دونوں میں جو بہترین اور عمدہ باتیں تھیں، انھیں اختیار کر لیا ہے۔ چنانچہ میں نے کوشش کی ہے کہ سیرت کا مطالعہ قارئین کے ایمان میں اضافہ، ان کے اخلاق و کردار کی بالیدگی کا ذریعہ بنے اور انھیں حق پرستی و حق گوئی اور دعوت و

تبلیغ کے لیے جدّ و جہد کا عادی بنائے۔ میں سیرت اس انداز میں لکھنا چاہتا ہوں جیسے ایک سپاہی اپنے کمانڈر کے بارے میں یا ایک متبع اور فرماں بردار اپنے قائد کے بارے میں، یا ایک طالب علم اپنے استاذ کے بارے میں لکھتا ہے۔ میری حیثیت ایک غیر جانب دار مؤرخ کی نہیں ہے جن کا ان لوگوں سے کوئی تعلق نہ ہو جن کے بارے میں وہ لکھ رہا ہے۔'' (ص ۴-۵)

خصائصِ کتاب

اولین ماخذ۔قرآن مجید

ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ کا ایک مشہور قول کتبِ حدیث میں نقل ہوا ہے کہ جب ان سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت کے بارے میں سوال کیا گیا تو انھوں نے فرمایا: ''کان خلقہ القرآن'' یعنی آپ کا اخلاق و کردار تو قرآن ہی سے عبارت تھا۔ دوسرے الفاظ میں قرآن مجید میں جو کچھ وارد ہوا ہے اسے عملی جامہ پہنایا جائے تو وہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت طیبہ بن جاتی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ قرآن مجید کا مطالعہ کرنے سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات وصفات، بعثت کے کوائف، دعوتِ دین کے مراحل، ہجرت، جنگوں کے واقعات، مشرکین اور یہود سے اس کے مباحث اوران کی زندگی کے دیگر اہم گوشوں کی تفصیلات معلوم ہو جاتی ہیں۔ اسی لیے یہ بات علمی حلقوں میں مسلّم ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیات پاک یا سیرت کا سب سے اہم ماخذ قرآن مجید ہے۔

شیخ محمد الغزالی نے قرآن مجید کو سیرت کے اولین ماخذ کے طور پر نہ صرف یہ کہ تسلیم کیا ہے، بلکہ اسے عملاً برتا بھی ہے اوراس کی تائید وحمایت میں بہت وضاحت سے اپنی رائے پیش کی ہے۔ لکھتے ہیں:

''بلاشبہ قرآن اسلام کی روح اوراس کا مغز ہے۔ اس کی محکم آیات میں اس کے دستور اور دعوت کے نکات بیان کیے گئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی حفاظت کا ذمہ لیا ہے۔ وہ ہستی جسے اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغام کی ترسیل وتبلیغ کے لیے منتخب فرمایا وہ دراصل زندہ قرآن ہے جو لوگوں میں چلتا پھرتا ہے۔ قرآن نے جن

امور اور احکام کو پیش کیا ہے وہ ہستی اس کا عملی نمونہ تھی۔ یہی وجہ ہے کہ آپؐ کا قول، فعل، تقریر، اخلاق، احکام اور آپؐ کی زندگی کے تمام گوشے دین اور شریعت کی اساس اور ماخذ تسلیم کیے گئے ہیں''۔ (ص ۳۶)

دوسرا ماخذ ۔ سنتِ نبوی

سیرت نبوی کا دوسرا ماخذ احادیث صحیحہ اور اولین کتبِ سیرت ہیں۔ محمد الغزالی لکھتے ہیں:

''انبیاء و رسل کی صحبت اور ان کی سیرت سے شغف سرتا سر خیر کا موجب ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت اور آپؐ کا اسوہ، آپ کی لائی ہوئی شریعت اور قانون سیرت کا دوسرا اہم ماخذ ہے۔ سیرت کا پہلا ماخذ وہ کتاب ہے جس کے نزول سے آپؐ کو مشرف کیا گیا تھا۔ یہ پوری طرح محفوظ ہے، لیکن آپؐ سے منقول سنن کے ساتھ بعض ایسے معاملات پیش آئے ہیں جن کے باعث انھیں قبول کرنے میں احتیاط لازم ہے۔ پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف جو کچھ منسوب کیا جاتا ہے وہ جوں کا توں اور ہو بہو قبول نہیں کیا جاسکتا ہے اور نہ یہ ضروری ہے کہ ہر وہ روایت جس کی نسبت آپؐ کی طرف ہو، صحیح ہو۔ یہ بھی ضروری نہیں کہ اس کے سمجھنے اور نقل کرنے میں بھی پوری صحت ملحوظ رکھی گئی ہو''۔ (ص ۳۸)

پوری کتاب میں جگہ جگہ احادیثِ کریمہ اور سنت مطہرہ کا حوالہ موجود ہے، لیکن یہ تمام حوالے چھان پھٹک اور بحث و تمحیص کے بعد لیے گئے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

''میں نے سیدنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت لکھنے کا پروگرام بنایا تھا تو یہ پختہ عزم تھا کہ (حوالوں کے باب میں) درست موقف اختیار کروں گا اور قابلِ احترام اور صحت مند مصادر پر اعتماد کروں گا۔ میرا یہ خیال ہے کہ میں اپنے ارادہ میں بڑی حد تک کامیاب رہا ہوں اور میں نے ان آثار و روایات سے بھرپور استفادہ کیا ہے جن سے ایک باخبر اور صاحب نظر فرد مطمئن ہوسکتا ہے''۔ (ص ۹)

علامہ محمد ناصر الدین الالبانی نے بعد میں شیخ الغزالی کی اس کتاب میں وارد

احادیث کی تخریج کی خدمت انجام دی تو پایا کہ شیخ نے بعض ضعیف احادیث کو قبول کیا ہے اور بعض صحیح احادیث کو ترک کر دیا ہے۔علامہ البانی کی ان تنقیدات کو شیخ غزالی نے اپنی کتاب کے اگلے ایڈیشن میں شامل کرلیا اور ان کا شکریہ ادا کرنے کے بعد حدیث کے بارے میں اپنے موقف کی ایک بار پھر وضاحت کی۔ان کی بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ کوئی حدیث اگر اپنی سند کے اعتبار سے ضعیف ہو،لیکن وہ کتاب الٰہی کی کسی آیت یا کسی صحیح حدیث کے مدلول کے مطابق ہوتو اس سے استناد کیا جاسکتا ہے۔اس کے برعکس اگر کوئی حدیث سند کے اعتبار سے صحیح ہو،لیکن وہ قرآن کی کسی آیت یا اس کے بیان کردہ کسی اصول سے ٹکراتی ہوتو اس سے استناد نہیں کیا جاسکتا۔(ص ۹-۱۲)

انھوں نے اپنے اس موقف کی وضاحت میں دونوں طرح کی احادیث نقل کی ہیں۔وہ احادیث، جو کتاب وسنت کی عام تعلیمات اور اصولوں سے متصادم تھیں، ان پر کلام کے بعد انھوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ وہ حدیث کا وزن اور اہمیت کو کم نہیں کررہے ہیں۔حدیث ان کے نزدیک اسلام کا یقینی طور سے دوسرا بنیادی ماخذ ہے۔(ص ۱۲) اس بحث کا خلاصہ وہ ان الفاظ میں پیش کرتے ہیں:

> ''میں نے سیرت نگاری میں اسی موقف کو اختیار کیا ہے۔ پس میں نے اس روایت کو قبول کرلیا ہے جس کا متن اسلام کے اصولوں اور احکام کے مطابق تھا، اگرچہ اس کی سند کم زور رہی ہو۔اسی طرح ان صحیح احادیث سے اعراض اور ان کا حوالہ دینے سے احتراز کیا ہے جو میرے فہم کے مطابق دین کی ثابت شدہ تعلیمات اور قوانین سے مطابقت نہیں رکھتی تھیں''۔(۱۳)

اس بات کا امکان تھا کہ شیخ غزالی کے اس موقف سے کوئی شخص ان پر احادیث سے بے اعتنائی یا انکار کا الزام عائد کرتا۔لیکن یہ امکان اس وقت معدوم ہوجاتا ہے جب وہ منکرین حدیث پر کھلی تنقید کرتے ہیں اور مختلف پہلوؤں پر اظہار خیال کے بعد یہ اعلان کرتے ہیں کہ ''احادیث کی جو دینی، اخلاقی اور تاریخی معنویت اور اہمیت ہے اس کی بنیاد پر ان کا انکار غیر مناسب اور قبیح عمل ہے''۔(ص ۳۸)

انھوں نے سنت رسول اللہ اور احادیث نبویہ سے استفادہ کی کچھ شرطیں بیان کی ہیں، جن میں سرفہرست یہ شرط ہے کہ آدمی قرآن اور اس کے علوم پر گہری نظر رکھتا ہو، کیونکہ قرآن مجید دین کا حقیقی دستور اور اس کی بنیاد ہے۔ دوسری شرط یہ ہے کہ آدمی احادیث کی سند کے ساتھ اس کے مدلولات و معانی، دین کی حقیقی روح اور مزاج کا ادراک وفہم اور ان سے شناسائی اور واقفیت رکھتا ہو۔ کیونکہ اسی کے بعد موقع ومحل کے اعتبار سے احادیث کا حوالہ دیا جاسکے گا۔ (ص ۴۱-۴۳)

دروسِ سیرت کا عصری انطباق

اس کتاب میں یہ کوشش بھی کی گئی ہے کہ سیرت کے واقعات کی روشنی میں مسلمانوں کی موجودہ دینی اور سماجی صورت حال پر تبصرہ کیا جائے اور قابل اصلاح پہلوؤں کی نشان دہی کرتے ہوئے صحیح رویے اور طرز عمل کی طرف موثر رہ نمائی کی جائے۔ شیخ غزالی نے لکھا ہے:

> ''میں جس وقت تحریری کام کررہا ہوتا ہوں میری نگاہوں کے سامنے مسلمانوں کے مختلف شعبہ جات میں ان کی پسپائی اور پس ماندی ہوتی ہے۔ اس لیے اس پر کسی کو کوئی تعجب نہیں کرنا چاہیے اگر میں ایک ایسا اسلوب اختیار کروں جس کے ذریعہ ہمارے موجودہ افسوس ناک مستقبل کی طرف اشارے کیے جائیں۔ چنانچہ میں نے جب بھی کوئی واقعہ بیان کیا ہے، یہ کوشش کی ہے کہ اس میں موجود سچائی، سلامتیٔ فکر اور حرکت وعمل کے عناصر کو ابھار کر پیش کروں، تاکہ اس کے ذریعہ مسلمانوں کی موجودہ پستی اور اضمحلال کا علاج کیا جاسکے''۔ (ص ۵)

وہ اپنے اس ارادہ میں کہاں تک کامیاب ہوئے ہیں اس کا اندازہ درج ذیل مثالوں سے ہوسکتا ہے:

(الف) احادیثِ نبوی اور سنتِ رسول سے استناد اور استفادہ کی بحث کے دوران میں انھوں نے بعض دین دار حلقوں کے اُس عمل پر تنقید کی ہے جس کے مطابق وہ دین کی کلی اور مجموعی تصویر کے بجائے اس کے کسی ایک گوشے یا گوشوں کی تصویر پیش

کرتے ہیں۔اسی طرح وہ دین پر عمل آوری کے دوران میں دین کی مجموعی تعلیمات کے بجائے چند ایک پر عمل کو ترجیح دیتے ہیں۔ان کا یہ عمل ان کے نزدیک دین کو محدود کرنے اور قرآن وسنت کی غلط تعبیر کے مترادف ہے۔(ص ۴۳)

(ب) عورت کے پردہ اور گھر سے باہر نکلنے کے بارے میں سخت رائے رکھنے والوں پر انھوں نے شدید نقد کیا ہے اور ایسی کئی احادیث اور واقعات نقل کیے ہیں جن سے عہد نبوی میں میدانِ عمل میں عورتوں کے متحرک ہونے کا اشارہ ملتا ہے۔اس ضمن میں حدیث بخاری بابت عبداللہ بن ام مکتوم کا رد کرتے ہوئے انھوں نے لکھا ہے:

''کیا یہ حدیث ہمیشہ ہماری سوسائٹی پر مسلّط رہے گی۔عورتیں اس کی بنا پر اپنے گھروں میں قید رہیں گی اور ان سے باہر کبھی نہیں نکلیں گی۔اس طرح کی ہدایت قرآن سے ثابت نہیں ہے۔قرآن میں تو یہ سزا ان عورتوں کے لیے بیان کی گئی ہے جو کسی فحش کام کا ارتکاب کر بیٹھیں۔'' (ص۴۶)

(ج) سیرت کے واقعات سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعوت و جہاد کے لیے تیاریوں اور پھر عملی سرگرمیوں اور ان کے لیے ممکنہ پیش بندیوں کا حوالہ دیتے ہوئے انھوں نے لکھا ہے:

''ان سب تیاریوں اور پیش بندیوں کے باوجود بعض قبائل عرب آپؐ کو دھوکہ دینے میں کامیاب ہوگئے۔انھوں نے آپؐ کے بعض منتخب اصحاب کو اپنے یہاں بلانے اور بئر معونہ میں انھیں قتل کرنے کے سنگین جرم کا ارتکاب کرڈالا۔یہ حضرات، جو اس سانحہ میں شہید ہوئے، اللہ کے انتہائی محبوب بندے تھے، لیکن اس کے باوجود اس نے کسی کے لیے یہ موقع فراہم نہیں کیا کہ وہ بغیر پرّ کے فضا میں اڑ جائیں یا اس انجام سے دوچار ہونے سے بچ جائیں جو ان کے لیے مقدر ہوچکا تھا، جیسا کہ آج کے مسلمان سوچتے ہیں۔بلاشبہ تحفظ اور احتیاط، تیاری اور مجاہدہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنن متواترہ میں سے ہیں اور انہی کی وجہ سے آپ کو اپنے دشمنوں پر غلبہ اور فتح حاصل ہوئی''۔(ص۵۱)

(د) مسلمانوں کی بے عملی اور فکری کجی پر مؤلف کتاب کی تنقید کی ایک مثال روضہ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر بعض مسلمانوں کا مستقل ازدحام اور وہاں عقیدت کے مختلف غیر مطلوب مظاہر ہیں۔ ان پر ناپسندیدگی کا اظہار انھوں نے کتاب میں کئی مواقع پر کیا ہے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:

''میں نے مدینہ منورہ میں روضۂ رسول پر لوگوں کی ایک بھیڑ دیکھی ہے، جو اس کی ہم سائیگی اور وہیں تاحیات قیام کرنے کی آرزومند تھی۔ اگر رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم زندہ ہوکر اپنے روضۂ مبارکہ سے باہر تشریف لائیں تو ان کی موجودگی کو ناپسند کریں گے اور ان کی ہم سائیگی پر کبھی آمادہ نہیں ہوں گے۔ ان کی ناقابل التفات شکل وصورت، قلتِ فہم، ضیاعِ وقت اور امورِ مسلمین سے غفلت اور بے توجہی فی الواقع اسلام سے ان کے تعلق کو مکڑی کے جالے سے بھی زیادہ کم زور ثابت کرتی ہے۔ میں نے ایک دن ان میں سے بعض سے کہا: تم لوگ یہاں کیا کر رہے ہو؟ اس سے تمھیں کیا فائدہ پہنچتا ہے؟ بلاشبہ وہ لوگ، جو رسالت اور نبوت کے مفہوم اور پیغام سے واقف ہیں اور اس کے دین کی اقامت اور شریعت کے نفاذ کے لیے کوشاں ہیں وہ یہاں سے ہزاروں میل دور رہتے ہوئے بھی تم سے زیادہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محبت وعقیدت کا ثبوت پیش کر رہے ہیں۔ دراصل روحانی اور عقلی رشتہ اور تعلق ہی وہ واحد کڑی ہے جو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپؐ کے امتیوں کے درمیان قائم ہے۔ پس کم زور، پریشان حال اور تھکی ہوئی روحوں اور عقلوں کو یہ زیب نہیں دیتا کہ وہ اس ذات گرامی سے اپنے تعلق کا دعویٰ کریں جو عقل وروح کو زندگی دینے اور اسے دینی ودنیوی سعادتوں سے ہم کنار کرنے کے لیے تشریف لائی تھی''۔(۲۲)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مقام ومرتبہ

سیرت نگاروں کے سامنے ایک نازک مسئلہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مقام ومرتبہ اور آپؐ کی حیثیت کے تذکرہ اور بیان کے وقت پیش آتا ہے۔ آپؐ بشر اور اللہ کے

رسول تھے۔ آپ کا تعارف ان حیثیتوں کو سامنے رکھ کر پیش کرنا ایک انتہائی نازک کام ہوتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے جو عقیدت و محبت ہے اس کے نتیجے میں اکثر اس مقام پر بے اعتدالی، مبالغہ آرائی اور غلو کا امکان رہتا ہے اور عملاً بہت سے سیرت نگاروں کے ساتھ ایسا ہوا ہے۔ انھوں نے اپنا زور معجزات اور خرقِ عادت واقعات کا تذکرہ کرنے پر لگایا ہے، جس سے ان کا مطالعہ کرنے والا حیران اور ششدر ہو کر رہ جائے اور وہ نبی کو مافوق البشر ہستی مان کر آپؐ کی عقیدت اور شیفتگی پر اکتفا کرے اور آپؐ کی اتباع اور اطاعت کی ہمت نہ کر سکے۔ شیخ غزالی نے سیرت کے واقعات کے انتخاب اور تذکرہ میں بڑی احتیاط سے کام لیا ہے اور اس کی پوری کوشش کی ہے کہ سچے موتیوں کے ساتھ خزف ریزے نہ آنے پائیں۔ انھوں نے ہر واقعہ کے ذکر سے پہلے اسے روایت اور درایت کی کسوٹی پر پرکھا ہے اور اگر انھیں کہیں کوئی سقم نظر آیا ہے تو اس پر بے لاگ تبصرہ کیا ہے۔ اس طرح اس کتاب کے مجموعی مطالعہ سے اُس 'انسان کامل' کی سیرت پاک ابھر کر سامنے آتی ہے جس کی اتباع و اطاعت کے لیے حوصلہ اور تحریک ملتی ہے اور وہ ایک دل کش، محبوب اور قابلِ عمل اسوہ قرار پاتی ہے۔

شیخ غزالی معجزات کے منکر نہیں ہیں، البتہ انھوں نے جس بات پر زور دیا ہے وہ یہ ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خرقِ عادت واقعات کے اظہار کے لیے نہیں، بلکہ انسانی شخصیت کو مربوط اور متوازن بنانے کے لیے دنیا میں تشریف لائے تھے۔ اس کی بہترین تعبیر اور کامل ترین نمونہ خود آپؐ کی زندگی تھی۔ ایک جگہ وہ لکھتے ہیں:

> ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی اس کائنات میں رائج اور نافذ قوانین اور اصولوں کے مطابق بسر ہوئی۔ آپؐ ان قوانین سے ماورا نہیں تھے۔ ایک بشر کی حیثیت سے آپؐ کو بھوک پیاس، مرض و صحت، تکلیف و آرام، غم و خوشی، تکان اور نشاط وغیرہ جیسی بشری کیفیات اور احوال سے گزرنا پڑا۔ ہاں یہ الگ بات ہے کہ آپؐ ایک منفرد اور مخصوص قسم کے انسان تھے۔ عام انسانوں میں بھی کئی درجے اور مرتبے کے لوگ ہوتے ہیں۔ کچھ اپنے اوصاف اور خصوصیات میں دوسروں سے فائق ہوتے ہیں۔

مشکلات حیات کا مقابلہ کرنے میں حزم و دانائی اور صبر و تحمل کے اوصاف کچھ افراد میں بہت زیادہ اور کچھ میں بہت کم ہوتے ہیں۔ اس اعتبار سے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کامل انسان تھے۔ آپؐ کی زندگی کائنات میں اللہ تعالیٰ کے معین کردہ ضوابط کے مطاق تھی۔ آپؐ کے سارے اعمال ان ہی ضوابط کے تحت صادر ہوئے''۔ (ص ۴۷)

سیرتِ نبوی پر بعض اعتراضات کے جوابات

اس کتاب کا ایک اہم وصف یہ ہے کہ اس میں سیرت نبوی پر کیے جانے والے بعض اعتراضات کے جوابات دیے گئے ہیں۔ مثلاً امہات المومنین کا تذکرہ آیا تو تفصیل سے تعدّد ازدواج پر کیے گئے اعتراضات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ سب سے پہلے مصنف نے ان اعتراضات کی پشت پر موجود دلائل کا معروضی انداز میں تذکرہ کیا ہے، پھر عقلی، سائنسی اور فطری دلائل اور شواہد سے اسلام میں تعدّد ازواج کی مصلحتوں اور حکمتوں پر روشنی ڈالی ہے۔ پھر ان شرائط اور ذمہ داریوں کا تذکرہ کیا ہے جو اسلام نے مرد پر عورتوں کے سلسلے میں عائد کی ہیں، مثلاً نان ونفقہ، تربیت و تعلیم، تعظیم و توقیر، عدل و قسط وغیرہ۔ انھوں نے ان شرائط کے بیان کے بعد لکھا ہے:

''یہ عدل کی حدود ہیں، جنھیں اللہ تعالیٰ نے تعدّد ازدواج کی صورت میں ملحوظ رکھنے کا حکم دیا ہے۔ جو شخص ان کی پابندی کرسکتا ہو وہ دو، تین یا چار عورتوں سے نکاح کرسکتا ہے، لیکن جو شخص ان کی پابندی نہ کرسکے اسے صرف ایک بیوی پر اکتفا کرنا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَاِنْ خِفْتُمْ اَلاَّ تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَۃً (ص ۴۶۹)

بعض اخبار نویسوں نے ایک موقع پر شیخ غزالی سے سوال کیا کہ اگر اسلام نے مردوں کو چار بیویاں رکھنے کی اجازت دی ہے تو عورتوں کو یہ اجازت کیوں نہیں دی؟ انھوں نے اس سوال پر اپنے حیرت و استعجاب کا اظہار کرتے ہوئے لکھا ہے:

''مجھے ان لوگوں پر تعجب ہے، اس لیے کہ وہ زنا کے ماحول میں زندگی گزارتے ہیں اور خاندان کی بنیاد پاکیزگی پر رکھنے کو شدید ناپسند کرتے ہیں ..... اس مریضانہ ذہنیت والے سوال کا جواب یہ ہے کہ جنسی تعلق کا اعلیٰ مقصد یہ ہے کہ

ایک خاندان کی بنیاد پڑے اور پاکیزگی کے ماحول میں بچوں کی تربیت ہو۔ یہ چیز ایسی عورت کے گھر میں حاصل نہیں ہوسکتی جس میں بہت سے مرد آتے جاتے ہوں، ان کا مقصد اس عورت سے صرف جنسی تلذّذ حاصل کرنا ہو اور اس سے ان کی اولاد نہ ہو"۔ (ص۲۶۹)

ساتھ ہی شیخ غزالی نے تعدّدِ ازواج کے حوالہ سے امت کے ایک طبقہ کی غلط روش اور نازیبا صورت حال پر بھی نکیر کی ہے۔ یہ طبقہ صرف شہوت پرستی اور نفسانیت کے ارادہ سے کئی عورتوں سے رشتۂ ازدواج قائم کرتا ہے، پھر ان کے نان ونفقہ کی ادائی، ان کے لیے علیٰحدہ مکانوں کی فراہمی، ان کے ساتھ عدل وانصاف کے تمام تقاضوں کا لحاظ اور ان کی تکمیل، ان کے بچوں کے ساتھ مساویانہ برتاؤ، ان کی تعلیم وتربیت پر مطلوبہ توجہ وغیرہ جیسے بنیادی دینی مطالبات اور شرائط کی تکمیل اور ایفا سے پہلو تہی اختیار کرتا اور غفلت برتتا ہے۔ اس تکلیف دہ صورت حال کی تصویر کشی کے بعد وہ یہ سوال کرتے ہیں کہ "کیا اس طبقہ کو تعدد ازدواج سے روک دینا اس مسئلہ کا واقعی حل ہے؟"، پھر اس کا جواب یہ دیتے ہیں: "نہیں، ہرگز نہیں۔ کسی جائز چیز سے محروم کردینے اور اس پر پابندی لگادینے کی اسلامی شریعت میں گنجائش نہیں ہے۔ 'قانون اپنی جگہ قانون کے طور پر باقی رہے گا، البتہ پیش آمدہ مسائل کے ازالہ کے لیے الگ سے راہیں نکالی جائیں گی"۔ (ص۴۶۹-۴۷۰)

انھوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ نصرانیت کے علاوہ تمام مذاہب میں تعدّدِ ازاج کی اجازت ہے۔ توریت میں ایسے کئی انبیاء کا تذکرہ ہے جن کی ایک سے زائد بیویاں تھیں۔ اس کے باوجود ان کے تقویٰ اور دین داری پر کوئی آنچ نہیں آئی۔ اسلام میں عورتوں سے کنارہ کشی مطلوب نہیں ہے۔ اس کی نظر میں گناہ کئی بیویوں کی موجودگی نہیں، بلکہ اباحیت اور جنسی بے راہ روی ہے۔ ☆☆☆

نوٹ: مولانا ابومسعود اظہر غوری کے قلم سے شیخ محمد الغزالی کی مذکورہ کتاب کا اردو ترجمہ شائع ہوگیا ہے۔ ملاحظہ کیجیے: سیرت پیغمبر اسلام، مکتبہ اشاعت القرآن، دہلی۔ اسی طرح اس کتاب پر علامہ البانی کے استدراکات کے اردو ترجمہ کی بھی اشاعت ہوگئی ہے۔ ملاحظہ کیجیے: روایاتِ سیرت کا تنقیدی جائزہ، مترجم: محمد رضی الاسلام ندوی، اسلامک بک فاؤنڈیشن، نئی دہلی، ۲۰۰۷ئ، (معاون مدیر)

دورِ جدید کی چند مفسّر خواتین

ڈاکٹر عفاف عبد الغفور حمید
مترجمہ: محترمہ ندیم سحر عنبریں

قرآن کریم میں غور و تدبر صرف مرد حضرات ہی نے نہیں کیا، بلکہ عورتیں بھی اس میں برابر کی شریک رہی ہیں۔ کیوں کہ قرآن کریم مرد و عورت دونوں سے یکساں خطاب کرتا ہے۔ وہ دعوت و اصلاح اور دین کے معاملات میں برابر کی مکلف ہیں۔ لہٰذا عورتوں نے دیگر علوم کی طرح قرآن کی تفہیم و تفسیر میں بھی اپنی خدمات انجام دی ہیں۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ حدیث کے ساتھ تفسیر کے میدان میں بھی درجۂ امامت پر فائز ہیں۔ اس دور میں اور بھی خواتین کے تفسیری اقوال ملتے ہیں۔ لیکن بعد کے ادوار میں تفسیر کے میدان میں خواتین کی کوششیں نسبتاً کم ہی دکھائی دیتی ہیں۔ دیگر علوم و فنون کے میدان میں ان کی تصنیفات و تالیفات معروف و مشہور ہیں، لیکن کسی خاتون کے قلم سے ایک بھی مکمل تفسیر کا ذکر نہیں ملتا۔

تاریخ و تراجم کی کتابوں میں علم تفسیر کے میدان میں خواتین کا بہت کم تذکرہ ملتا ہے۔ مثلاً ابن سعد کی طبقات، ابن عبد البر کی استیعاب، ابن اثیر کی اسد الغابۃ، ابن حجر کی تہذیب التہذیب، تقریب التہذیب اور الدر الکامنۃ فی اعیان المائۃ الثامنۃ میں بعض خواتین کا تذکرہ ہے۔ ماضی قریب کی کتب میں سے ایک اسماعیل بغدادی کی **هدية العارفين في أسماء المؤلفين و آثار المصنفين** ہے۔ اس میں دو خواتین کا تذکرہ ہے۔ زرکلی نے **الأعلام** میں تیرہ خواتین کا اور عمر رضا کحالہ نے **أعلام النساء** میں دس خواتین کا تذکرہ کیا ہے، جن کا تفسیر کے میدان میں کچھ کام ہے۔ ایک کتاب

عادل نویھض کی **معجم المفسرین من صدر الاسلام حتی العصر الحاضر** (دو جلدوں میں) ہے،لیکن اس میں صرف ایک مفسرہ کا ذکر ہے،جس کا ذکر اسماعیل بغدادی نے بھی اپنی کتاب میں کیا ہے۔

موجودہ دور میں خواتین کو قرآنی علوم میں اپنی کارگردگی ظاہر کرنے کے مواقع حاصل ہوئے ہیں۔عرب و مسلم ممالک میں قرآن کریم کی تعلیم کے لیے مساجد اور روایتی مدارس کے علاوہ ان کے لیے مخصوص سرکاری اور غیر سرکاری ادارے قائم کیے گئے ہیں۔ اس طرح آہستہ آہستہ ان کی توجہ قراءت اور حفظِ قرآن سے قرآن کی تفسیر وتشریح کی طرف مبذول ہوئی۔اس میدان میں ان کی علمی کاوشیں انفرادی سطح پر بھی ظاہر ہوئیں اور کالجوں اور یونی ورسٹیوں کا تعاون بھی اس راہ میں حاصل رہا۔ چنانچہ ہمیں قرآنی علوم اور قرآن کریم کی جزوی اور کلّی تفسیر پر خواتین کی متعدد تالیفات ملتی ہیں۔اس میدان میں ان کی علمی کاوشیں اگرچہ موجودہ دور میں بھی کم ہیں ،لیکن بہر حال سابقہ ادوار کے مقابلے میں صورتِ حال قدرے بہتر ہے۔موجودہ دور میں ایک بڑی تعداد ایسی خواتین کی ہے جنھوں نے اسلامی علوم بالخصوص تفسیر اور علوم قرآنی میں ایم۔فل اور ڈاکٹریٹ کے مقالے لکھے ہیں۔کچھ ایسی اسکالر بھی ہیں جنھوں نے خاص طور سے قرآن کی بعض سورتوں کی تفسیر اور قرآن سے متعلق مختلف موضوعات پر کتابیں تصنیف کی ہیں۔

آئندہ سطور میں دورِ جدید کی تین ایسی خواتین کا تذکرہ کیا جائے گا، جنھوں نے تفسیر وعلوم قرآنی کے میدان میں قابلِ ذکر خدمات انجام دی ہیں۔ساتھ ہی ان کی تالیفات اور منہج تفسیر کا تجزیاتی مطالعہ بھی پیش کیا جائے گا۔

(۱) عائشہ عبدالرحمن بنت الشاطی

عائشہ عبدالرحمن بنت الشاطی مصر کے شہر دمیاط میں ۱۶ نومبر ۱۹۱۳ء کو پیدا ہوئیں۔انھوں نے علمی ماحول میں پرورش پائی۔ پانچ سال کی عمر میں ان کی تعلیم کی ابتدا ہوئی۔انھوں نے گرمیوں کی چھٹیوں میں قرآن کریم بھی حفظ کیا۔دمیاط میں ابتدائی اور ثانوی

تعلیم حاصل کرنے کے بعد ۱۹۳۵ء میں قاہرہ یونیورسٹی میں شعبۂ عربی میں داخلہ لیا، جہاں سے انھوں نے ۱۹۳۹ء میں گریجویشن مکمل کیا۔ قاہرہ یونیورسٹی میں ان کی ملاقات مصر کی متعدد عظیم فکری و ادبی شخصیات سے ہوئی۔ ان میں سے ایک شیخ امین الخولی تھے، جو مشہور فکری و ادبی مجلس ۔ مدرسۃ الأمنائ ۔ کے صدر نشیں تھے۔ تفسیر قرآن میں ان کا مخصوص منہج تھا، جو 'منہج بیانی' کے نام سے معروف تھا۔ بعد میں عائشہ نے ان سے شادی کر لی۔

عائشہ عبدالرحمن نے ۱۹۴۱ء میں **الحیاۃ الانسانیۃ عند أبی العلاء المعرّی** کے موضوع پر ایم، اے اور ۱۹۵۰ء میں **رسالۃ الغفران لأبی العلاء المعرّی** کے موضوع پر پی، ایچ، ڈی کی ڈگریاں حاصل کیں۔ ا؎ استاد امین الخولی نے انھیں مشورہ دیا کہ اگر وہ تفسیرِ قرآن کے موضوع پر کام کرنا چاہتی ہیں تو پہلے عربی ادب کا مطالعہ کریں اور اس زبان میں خوب مہارت حاصل کر لیں، جو قرآن کریم کی زبان ہے۔ انھوں نے اس مشورہ کو قبول کیا اور بیس سال تک عربی زبان و ادب سے وابستہ رہنے کے بعد پھر قرآنی اور اسلامی علوم کی طرف توجہ کی۔

اعلیٰ تعلیم سے فراغت کے بعد انھوں نے بہت سی عرب یونیورسٹیوں میں تدریس کے فرائض انجام دیے۔ قاہرہ، عین شمس، ام درمان، خرطوم الجزائر، بیروت، امارات، ریاض کی یونیورسٹیوں میں مختلف مناصب پر فائز رہیں۔ آخر میں جامعہ القرویین مراکش کے کلیۃ الشریعۃ میں تفسیر کی پروفیسر ہو گئی تھیں۔ وہاں انھوں نے تقریبا بیس سال گزارے۔

بنت الشاطی نے عربی زبان و ادب، تنقید، تراجم، تحقیقِ مخطوطات، تفسیر اور حدیث کے موضوعات پر چالیس (۴۰) سے زائد کتابوں کا گراں قدر سرمایہ چھوڑا ہے۔ اسلامی موضوعات پر ان کی سب سے اہم کتابیں **التفسیر البیانی للقرآن الکریم** اور **القرآن و قضایا الانسان** ہیں۔ متعدد بین الاقوامی کانفرنسوں میں شرکت کی وجہ سے ان کی شہرت عرب اور مسلم ممالک سے تجاوز کر گئی تھی۔ بنت الشاطی کی اسلامیات میں خدمات کی بنا پر انھیں شاہ فیصل ایوارڈ سے نوازا گیا۔ اس کے علاوہ متعدد

اداروں نے انھیں اعزازی رکنیت تفویض کی،مثلاً مجمع البحوث الاسلامیۃ قاہرہ ۔ اوائلِ دسمبر ۱۹۹۸ء میں وفات پائی۔

التفسیر البیانی للقرآن الکریم اوراس کا منہج

التفسیر البیانی للقرآن الکریم عربی زبان و ادب اور قرآنی علوم کے درمیان ایک کڑی ہے۔ یہ پورے قرآن کریم کی تفسیر نہیں ہے، بلکہ اس میں بعض متوسط اور چھوٹی سورتوں کی تفسیر کی گئی ہے۔ یہ دو اجزاء میں ہے۔ بنت الشاطی نے قرآن کریم کی تفسیر میں اپنے استاد اور شوہر امین الخولی کے منہج کی پیروی کی ہے۔ امین الخولی نے اپنے منہج کو اپنی کتاب **مناھج التجدید** میں بیان کیا ہے۔ بنت الشاطی نے اس کا خلاصہ اپنی تفسیر کے پانچویں ایڈیشن کے مقدمہ میں کیا ہے۔ اس کے بنیادی نکات درج ذیل ہیں:

۱۔ بحث و مطالعہ کا موضوعاتی منہج اختیار کیا جائے۔جس موضوع کا مطالعہ مقصود ہو اس پر قرآن کی تمام آیات یکجا کر لی جائیں۔

۲۔ قرآنی نص کو سمجھنے کے لیے آیات کو ترتیبِ نزول کے اعتبار سے جمع کیا جائے، پھر اسبابِ نزول سے متعلق مرویات پیش نظر رکھی جائیں۔کسی آیت کے نزول کے سلسلہ میں اس کے مخصوص سبب کے بجائے عموم لفظی کو پیش نظر رکھا جائے۔ مصحف کی موجودہ ترتیب اللہ تعالی کی طرف سے توقیفی ہے۔اس ترتیب کے ثبوت کا درجہ ترتیبِ نزول کی صحیح روایات کے درجہ سے بڑھ کر ہے ۔ اس بنا پر صرف ان روایات کو قبول کرنا چاہیے جو مصحف کی موجودہ ترتیب سے متعارض نہ ہوں۔

۳۔ الفاظِ قرآن کے معانی و مطالب کو سمجھنے کے لیے پہلے یہ دیکھا جائے کہ عربی زبان ولغت میں کن حقیقی اور مجازی معانی میں ان کا استعمال ہوا ہے۔ پھر قرآن کی دلالت کو سمجھنے کے لیے پورے قرآن کا استقراء کیا جائے اور دیکھا جائے کہ مخصوص آیت اور دیگر مقامات پر وہ کن معانی میں آئے ہیں۔

۴۔ قرآنی نص کے سیاق کو بھی پیش نظر رکھا جائے، پھر اس پر مفسرین کے اقوال کو پرکھا جائے۔ان میں سے جن اقوال کو نصِّ قرآن قبول کرتا ہو، انھیں اختیار کیا جائے اور کتبِ تفسیر میں جو اسرائیلی روایات، مسلکی خرافات اور بے جا تاویلات بھر دی گئی ہیں، ان سے احتراز کیا جائے۔۲؎

حقیقت یہ ہے کہ بنت الشاطی نے جس منہج کو امین الخولی کی طرف منسوب کیا ہے، وہ شیخ محمد عبدہؒ کا منہج ہے، جسے بعد میں امین الخولی، رشید رضا اور المراغی نے اختیار کیا ہے۔

بنت الشاطی کی تفسیر کی خصوصیات

بنت الشاطی کی تفسیر کا مطالعہ کرنے سے اس کی درج ذیل خصوصیات نمایاں ہوتی ہیں:

اول: ان کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ اعراب اور اسرارِ بیانی جاننے کے لیے خود قرآن سے رجوع کیا جائے۔ یہ دیکھا جائے کہ زیرِ مطالعہ لفظ اور اس کے ہم معنیٰ دیگر الفاظ قرآن میں کہاں کہاں آئے ہیں اور وہاں اس کے کیا معنی ہیں؟ پھر یہ دیکھا جائے کہ اس مخصوص جگہ، جہاں کا مطالعہ مقصود ہے، اس کے کیا معنی ہیں؟ وہ کہتی ہیں:

> ”ہم نحویوں اور ماہرینِ بلاغت کے اقوال کو قرآن کی روشنی میں جانچیں گے، قرآن کو نحو و بلاغت پر جانچنے کی کوشش نہیں کریں گے۔ قرآن کے صریح نص و سیاق کے سلسلے میں ہمیں علمائے سلف کی تاویلات اختیار کرنے کی ضرورت نہیں ہے، تاکہ نحو کے قواعد اور علومِ بلاغت کے ضوابط درست ہو جائیں۔اس لیے کہ قرآن اپنی اصالت، اعجاز اور بیان کی بلند چوٹی پر فائز ہے اور وہ ہر طرح کی آمیزش سے پاک ہے۔ اس معاملے میں شعری شواہد بھی پیش کرنے کی ضرورت نہیں۔“۳؎

مثال کے طور پر سورۂ علق میں لفظ أرَأیتَ تین بار آیا ہے۔ وہاں اس کا مفعولِ ثانی مذکور نہیں ہے۔مفسرین نے اس پر طویل بحثیں کی ہیں۔ بنت الشاطی نے

اس کے بارے میں زمخشری کی رائے اور اس پر ابو حیان التوحیدی کا رد نقل کرنے کے بعد لکھا ہے:

> ''مفسرین کے اختلافات کے معاملے میں جب ہم بیانِ قرآنی کو حَکَم بناتے ہیں تو قرآن کے ایک اہم اسلوب سے آشنا ہوتے ہیں۔ وہ یہ کہ قرآن جب استفہامی انداز میں أرَ أیتَ کہہ کر تمام لوگوں کو مخاطب کرتا ہے تو مفعولِ ثانی کی ضرورت نہیں رہتی، بلکہ ایسے مواقع پر قرآن عبرت ونصیحت کے پہلو کی طرف توجہ دلانا چاہتا ہے۔ جیسے ملاحظہ کیجیے درج ذیل آیات: اَرَأَیۡتَ الَّذِیۡ یُکَذِّبُ بِالدِّیۡنِ (الماعون:۱)۴؎ أَفَرَأَیۡتُم مَّا تُمۡنُون (الواقعۃ:۵۸) أَفَرَأَیۡتُم مَّا تَحۡرُثُونَ (الواقعۃ:۵۸) وغیرہ۔ ۵؎ ۔۔۔ یہ قرآن کا ایک مخصوص اسلوب ہے کہ جب لفظ رأی سے پہلے حرفِ استفہام ہو اور خطاب کیا گیا ہو تو مفعول ثانی کی ضرورت نہیں رہتی۔ اس لیے نحوی قواعد کی رُو سے مفعول ثانی کو محذوف یا مقدّر ماننے اور اسے تلاش کرنے سے بہتر یہ ہے کہ ہم اس بات پر غور کریں کہ قرآن نے یہاں عبرت ونصیحت کے کس پہلو کی طرف توجہ دلائی ہے۔''۶؎

دوم: وہ تفسیر کے روایتی منہج پر تنقید کرتی ہیں جس کے مطابق قرآن کے کسی نص کا مطالعہ دیگر نصوص کو سامنے رکھے بغیر کیا جاتا ہے۔ وہ کہتی ہیں کہ نصِّ قرآنی کا مطالعہ موضوعاتی طرز پر کرنا چاہیے، جس طرح دیگر نصوص کا مطالعہ کیا جاتا ہے، جن کا قرآن کریم کے اعجازِ بیان سے کوئی مقابلہ ہی نہیں ہے۔ ان کا خیال ہے کہ عربی زبان و ادب میں مہارت ہی قرآن میں غور وفکر اور اس کے صحیح فہم کا مثالی طریقہ ہے۔ وہ نصِّ قرآن کے منہجی مطالعہ کو اس کی دلالتوں کو سمجھنے اور اس کے مقاصد کے ادراک کرنے کا ذریعہ سمجھتی ہیں۔ اس لیے وہ قرآن کے مفرد الفاظ اور اسالیب کے فہم کو ضروری قرار دیتی ہیں۔ ۷؎

سوم: وہ اس بات کی کوشش کرتی ہیں کہ قرآن کے اسرارِ بیانی تک رسائی

حاصل کرنے کے لیے اس کے نص کے ہر لفظ اور ہر حرکت کو سمجھنے کی کوشش کی جائے۔ ان کا خیال ہے کہ قرآن کے ایک لفظ کی جگہ کوئی دوسرا لفظ نہیں لے سکتا، ایک حرف کی جگہ دوسرا حرف نہیں لے سکتا اور ایک حرکت کی جگہ دوسری حرکت نہیں آسکتی۔ اپنی اس رائے کو انھوں نے **فواتح السور** میں بیان کیا ہے۔۸؎ اپنی تفسیر کی جلد دوم کے مقدمہ میں ترادف کا انکار کرتے ہوئے وہ کہتی ہیں:

> ''اس تفسیر میں، اسی طرح ہر تفسیر میں اہم ترین مسئلہ یہ ہے کہ کوئی بھی حرف یا کلمہ، جو قرآن میں آیا ہو، ایسا نہیں ہے کہ اس کی جگہ دوسرا حرف یا کلمہ آسکے۔''۹؎

اپنی تفسیر میں انھوں نے **القسم** اور **الحلف**، **اللھو** اور **المشغلة** کے مترادف ہونے کی نفی کی ہے۔ اسی طرح انھوں نے اپنی کتاب **الاعجاز البیانی للقرآن الکریم** میں اس موضوع پر مفصل بحث کی ہے اور اس کی بہت سی مثالیں دی ہیں۔۱۰؎

اہلِ نحو کے برخلاف بنت الشاطی نے قرآن میں حرفِ زائد سے انکار کیا ہے۔ مثلاً آیت: **مَا أَنتَ بِنِعْمَةِ رَبِّکَ بِمَجْنُونٍ** (القلم:۲) میں لفظ **نعمة** سے قبل ب کو مفسرین اور نحویین نے ب زائدہ کا نام دیا ہے، لیکن بنت الشاطی کے نزدیک یہ ب زائدہ نہ ہوکر قرآن کا خاص اسلوب ہے اور وہ یہ کہ جب ب ما و لیس کی خبر بنتی ہے تو جحد و انکار کے معنی میں ہوتی ہے۔ اس طرح کی مثالیں قرآن میں کئی جگہ موجود ہیں، مثلاً: **وَمَا أَنتَ بِهَادِي الْعُمْيِ عَن ضَلَالَتِهِمْ** (الروم: ۵۳) **وَمَا أَنَا بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيدِ** (ق: ۲۹) **وَمَا اللَّهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ** (البقرة: ۷۴)۔ اور یہ قرآن کا خاص اسلوب ہے۔۱۱؎

بنت الشاطی نے لیس اور مانافیہ کی خبر کی حکمت کو پالیا۔ انھوں نے قرآن کی اس طرح کی تمام آیات کا استقراء کیا تو پایا کہ جب ما و لیس کی خبر پر ب داخل ہوتی ہے تو وہ زائد نہیں ہوتی، بلکہ ایک بلاغی قاعدہ کے مطابق آتی ہے اور اس سے قرآن کریم کا اعجاز بیان ظاہر ہوتا ہے۔۱۲؎

حروفِ مقطعات کے سلسلہ میں انھوں نے تمام علماء کے اقوال ذکر کرکے علامہ ابن القیمؒ کے قول کو ترجیح دی ہے کہ اس سے حروف کی عظمت اور ان کا شرف بتانا مقصود ہے کہ یہ صرف قرآن کا ہی اسلوب ہے اور اسی کا اعجازِ بیان ہے کہ عام حروف سے ایسا کلام وجود میں آیا جس کے مثل لانے سے تمام انسان عاجز ہیں۔ ۱۳؎

چہارم: وہ عقل ونقل کے درمیان ہم آہنگی کی داعی ہیں۔ان کا ایک امتیاز یہ ہے کہ انھوں نے عقل ونقل کے درمیان انتہائی مہارت سے ہم آہنگی پیدا کی ہے اور تقلید کو چھوڑ کر تجدید کی روش اختیار کی ہے۔انھوں نے تفسیر میں بعض آراء سلف کو قبول کیا ہے اور بعض کو رد کیا ہے۔اپنی کتاب **التفسیر البیانی**، جزء ثانی کے مقدمہ میں کہتی ہیں :

> ''ہم مفسرین کی علمی کاوشوں سے فائدہ اٹھاتے ہیں،ان کے اقوال کو قرآن پر پیش کرتے ہیں اور ان میں جو اقوال قرآن کے نص اور اس کے سیاق سے مطابقت رکھتے ہیں، انھیں قبول کر لیتے ہیں۔'' ۱۴؎

پنجم: کتبِ تفسیر میں بہت سی اسرائیلی روایات ،اسی طرح مفسرین کے ذوق، عقل وفہم، ماحول اور مسلکی ،سیاسی اور گروہی عصبیتوں کی وجہ سے بہت سی باتیں تفسیروں کا حصہ بن گئیں۔ بنت الشاطی نے اپنی تفسیر کو اس طرح کی تمام چیزوں سے پاک کرنے کی ہر ممکن کوشش کی ہے۔ ۱۵؎ مثلاً بعض کتبِ تفسیر میں ہے کہ حوا آدم کے جنت سے نکالے جانے کا سبب تھیں۔ بنت الشاطی اس سے اختلاف کرتی ہیں ۔وہ ان لوگوں پر زبردست حملہ کرتی ہیں جو عورت کو محض شہوت پوری کرنے کا ذریعہ اور معصیت وگم راہی کا مرکز قرار دیتے ہیں۔ وہ کہتی ہیں کہ قرآن عورت کی تکریم کرتا ہے اور زندگی کی تعمیر میں اسے مرد کے ساتھ شریک کرنے کا مطالبہ کرتا ہے۔

یہی موقف انھوں نے تفسیر اشاری (صوفیانہ تفسیر) کے سلسلہ میں اختیار کیا ہے۔مثلاً صوفیہ کہتے ہیں کہ **والضحیٰ** سے مراد حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا روئے انور اور **واللیل** سے مراد آپؐ کے بال ہیں، یا یہ کہ **والضحیٰ** سے اہل بیت مرد اور **واللیل** سے اہل بیت خواتین مراد ہیں۔ بنت الشاطی اس طرح کے تمام اقوال کا رد کرتی ہیں۔ ۱۶؎

ششم : ان کی تفسیر کا ایک خاص انداز اس کا موضوعی منہج ہے، جسے انھوں نے اپنے استاد شیخ امین الخولی سے لیا ہے۔ انھوں نے اپنے مقدمہ میں اس کا ذکر کیا ہے۔ ایک موضوع سے متعلق قرآن میں موجود تمام آیات کو وہ ایک جگہ جمع کر کے تفسیر کرتی ہیں اور اس کے الفاظ اور اسالیب کے استعمالات سے رہ نمائی حاصل کرتی ہیں۔۱۷؎ قرآن کی بعض چھوٹی سورتوں کی تفسیر میں انھوں نے اس منہج کو اختیار کیا ہے۔ ان میں سے اکثر مکی سورتیں ہیں، جن میں اسلام کے بنیادی اصولوں سے بحث کی گئی ہے۔ ان کا منہج استقرائی ہے۔ انھوں نے **القرآن یفسّر بعضه بعضاً** کے اصول پر تفسیر کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ تفسیرِ قرآن کا سب سے اچھا طریقہ ہے۔ مثال کے طور پر لفظ **حطمة** کی تفسیر کرتے ہوئے بتاتی ہیں کہ اس کے مادہ سے ایک دوسرا لفظ **حطام** قرآن میں تین مرتبہ آیا ہے۔(الزمر:۲۱، الواقعۃ : ۶۵، الحدید:۲۰)۱۸؎ اسی طرح آیت: **مَا أَنتَ بِنِعمَةِ رَبِّکَ بِمَجنُونٍ** (القلم:۲) کی تفسیر میں وہ قرآن کے ان تمام مقامات کا استقراء کرتی ہیں جہاں لفظ **نعمة** اور **نعیم** آئے ہیں، پھر اس سے یہ نتیجہ اخذ کرتی ہیں کہ دونوں ایک معنیٰ میں نہیں ہیں، بلکہ قرآن میں ہر جگہ **نعمة** کا استعمال دنیاوی نعمتوں کے لیے، جب کہ **نعیم** کا استعمال اخروی نعمتوں کے لیے ہوا ہے۔۱۹؎

ہفتم: اسبابِ نزول کی روایات اور ترتیبِ نزول کے سلسلہ میں ان کا موقف یہ ہے کہ اسبابِ نزول کی روایات کا، زمانۂ نزول کے حالات کو سمجھنے کے لیے اعتبار کیا جائے گا، لیکن اس کا مطلب یہ ہے کہ صحابۂ کرام نے ان آیات کو اپنے حالات پر منطبق کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اگر وہ حالات نہ پیش آئے ہوتے تو وہ آیات نازل ہی نہ ہوتیں۔ اسی طرح وہ کہتی ہیں کہ آیاتِ قرآن اور الفاظِ قرآن کی دلالتوں میں تدبر کرنے کے لیے سیاقِ عام کے فہم میں ترتیبِ نزول کا اعتبار کیا جائے گا۔۲۰؎

ہشتم: وہ سائنسی تفسیر کی سخت مخالف ہیں۔ ان کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ قرآن

کتابِ ہدایت ہے۔ یہ فزکس، کیمسٹری یا دیگر سائنسی علوم کی کتاب نہیں ہے۔ انھوں نے مجلۃ الاھرام میں اس سلسلے میں متعدد مقالات لکھے تھے۔ مثال کے طور پر آیت: خَلَقَ الْإِنسَانَ مِنْ عَلَقٍ (العلق: ۲) کے تحت لکھتی ہیں:

> ''اس آیت کے تحت نئے محققین نے علم الجنین کی بحث شروع کر دی ہے اور فزیالوجی اور بایولوجی کے ماہرین کی کتابوں کے حوالے دیے ہیں، تاکہ وہ اس آیت کی تشریح کریں جو نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی معرفت ایسی امّی قوم پر اتری تھی، جسے علم جنین کی کچھ واقفیت نہیں تھی۔ یہ بات نا قابل تصور ہے کہ قرآنِ کریم خالق کی ربوبیت اور قدرت کے اثبات کے لیے ایسی باتیں پیش کرے جو ان لوگوں کے لیے نا قابل تصور ہو اور جن کے فہم و ادراک سے وہ قاصر ہوں۔''۲۱؎

نہم: انھوں نے متقدمین ومتاخرین اور معاصرین کی مختلف کتبِ تفسیر پر اعتماد کیا ہے۔ مثلاً تفسیر طبری، زمخشری کی کشاف، ابو حیان کی البحر المحیط، رازی کی تفسیر کبیر، نیساپوری کی غرائب التفاسیر وغیرہ۔ اس کے ساتھ ہی انھوں نے علوم القرآن کی بعض تصانیف سے بھی استفادہ کیا ہے۔ مثلاً سیوطی کی الاتقان اور ابن القیم الجوزی کی التبیان فی اقسام القرآن۔ وہ اپنی تفسیر میں محمد عبدہ کی آراء کا بھی حوالہ دیتی ہیں، لیکن ان مصادر سے استفادہ کرتے ہوئے انھوں نے مفسرین کی آراء کو من وعن قبول نہیں کرلیا ہے، بلکہ وہ بسا اوقات ان پر تنقید بھی کرتی ہیں۔

(۲) زینب غزالی

زینب محمد الغزالی الجبیلی جنوری ۱۹۱۷ء میں مصر میں بحیرہ کے ایک گاؤں میں پیدا ہوئیں اور اپنے والدین کے سایۂ عاطفت میں اسلامی ماحول میں پرورش پائی۔ ان کی تربیت میں ان کے والد کا جو جامعہ ازہر کے علماء میں سے تھے، اثر بہت زیادہ ہے۔ ان کے انتقال کے بعد وہ اپنی والدہ کے ہم راہ اپنے بھائیوں کے پاس قاہرہ چلی گئیں،

جو وہاں پڑھتے اور کام بھی کرتے تھے۔ انھوں نے سرکاری اسکول میں اپنی تعلیم جاری رکھی، ساتھ ہی تفسیر اور فقہ کا علم جامعہ ازہر کے علماء سے حاصل کیا۔ ان کے اساتذہ میں شیخ عبدالمجید اللبان وکیل الازہر، شیخ محمد سلیمان النجار رئیس قسم الوعظ والارشاد اور شیخ علی محفوظ رکن ھیئۃ کبار العلماء قابل ذکر ہیں۔

ابتدا میں زینب غزالی مصر میں آزادیٔ نسواں کی علم بردار مشہور خاتون ہدیٰ شعراوی کی تنظیم سے جڑ گئی تھیں اور اس کی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے لگی تھیں، لیکن کچھ عرصہ کے بعد انھوں نے اس سے علیٰحدگی اختیار کر لی۔ ۱۹۳۷ء میں انھوں نے جمعیۃ السیدات المسلمات کے نام سے عورتوں کی تنظیم کی بنیاد ڈالی اور مصر کے گوشے گوشے میں اسے فروغ دیا۔ اس تنظیم کے تحت وہ مختلف علاقوں میں دینی اجتماعات منعقد کرتی تھیں۔ السیدات المسلمات کے نام سے اس کا ایک مجلہ بھی نکلتا تھا۔ انھوں نے بہت سے مسلم اور عربی ممالک کا سفر کیا اور وہاں دینی موضوعات پر لیکچر دیے۔ وہ حسن البنا کی فکر سے بہت متاثر تھیں، جس کے نتیجہ میں انھوں نے اپنی تنظیم کو ان کی جماعت 'الاخوان المسلمون' میں ضم کر دیا تھا۔

۱۹۶۵ء میں سیاسی پارٹیوں اور حکومت کے درمیان ٹکراؤ شروع ہوا، جس نے سنگین صورت اختیار کر لی۔ زینب غزالی کو جمال عبد الناصر سے ملاقات سے انکار کے نتیجہ میں گرفتار کر لیا گیا۔ اس موقع پر انھوں نے پوری جرأت سے کہا کہ ''میں ایسے شخص سے ملاقات نہیں کر سکتی، جس کے ہاتھ شہید عبدالقادر عودہ کے خون سے رنگے ہوئے ہوں۔'' وہ ۱۹۷۱ء تک جیل میں بند رہیں۔ اس عرصہ میں انھیں شدید جسمانی اذیتوں سے دوچار ہونا پڑا۔ أیام من حیاتی کے عنوان سے انھوں نے اپنی ایک جیل ڈائری لکھی ہے۔ یہ ایک تاریخی دستاویز ہے اور ادبی رنگ بھی لیے ہوئے ہے۔

زینب غزالی نے متعدد کتابیں تصنیف کی ہیں، جن میں سے ابنتی (۲ جلدیں)، **مشکلات الشباب و الفتیات فی مرحلة المراهقة (۲ جلدیں)، نحو بعث جدید، نظرات فی الدین و الحیاة، شرح الاربعین النوویة، ملک و آمال شعب**

اور نظرات فی کتاب اللہ خاص طور سے قابل ذکر ہیں ۔ان کی بعض کتابوں کا مختلف زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ ۲۲؎

نظرات فی کتاب اللہ درحقیقت زینب الغزالی کی تفسیر ہے۔اس میں انھوں نے سورۂ ابراہیم تک کی تفسیر کی ہے۔وہ جیل میں قرآن پڑھتی تھیں تو مصحف کے حاشیہ پر ضروری تشریحات نوٹ کر لیتی تھیں۔جیل سے رہائی پر یہ مصحف تو انھیں نہیں مل سکا،لیکن بعد میں انھوں نے اپنی یادداشت سے دوبارہ اس کام کو انجام دیا۔ یہ تفسیر ۱۹۹۴ء میں شائع ہوئی ہے۔اس پر ڈاکٹر الفرماوی نے نظر ثانی کی ہے۔ ۲۳؎

زینب غزالی کا تفسیری منہج

زینب غزالی کی تفسیر کی خصوصیات کو درج ذیل نکات کی صورت میں بیان کیا جاسکتا ہے:

اول: وہ کسی سورہ کی تفسیر کرتے ہوئے اس کی ابتدا میں بتاتی ہیں کہ وہ مکی ہے کہ مدنی ؟اس میں آیات کی تعداد کتنی ہے؟ اس کے فضائل کیا ہیں؟ اوراس کے سببِ نزول میں کون کون سی صحیح روایتیں مروی ہیں ؟ مثال کے طور پرانھوں نے سورۂ آل عمران کی ابتدا میں بیان کیا ہے کہ مدینہ میں ۹ھ میں نجران سے ایک وفد آیا تھا،جس نے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مناظرہ کیا تھا۔آپؐ نے انھیں مباہلہ کی دعوت دی،لیکن انھوں نے اس سے انکار کر دیا اور جزیہ ادا کرنے پر رضا مندی ظاہر کی۔اس سے وہ غیر مسلموں کو اسلام کی دعوت کے وجوب اور سابقہ شریعتوں کے نسخ پر استدلال کرتی ہیں ۔ ۲۴؎

دوم: وہ اپنی تفسیر میں ماثور پر اعتماد کرتی ہیں ۔ چنانچہ تفسیر میں قرآن کی دیگر آیات ،اسی طرح صحیح احادیث،صحابۂ کرام، تابعینِ عظام اور علمائے اسلاف کے اقوال سے استدلال کرتی ہیں ۔مثال کے طور پر سورۂ بقرہ کی ابتدا میں تقویٰ کی تشریح کرتے ہوئے وہ سورۂ آل عمران کی ایک آیت،حدیثِ نبوی اور حضرت عمرؓ،حضرت علیؓ ، اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے اقوال پیش کرتی ہیں ۔ ۲۵؎

سوم: وہ متقدمین کی ماثور تفسیروں پر اعتماد کرتی ہیں۔ مثلاً تفسیر ابن کثیر اور تفسیر قرطبی۔ اسی طرح جدید تفسیروں میں سید قطب کی تفسیر فی ظلال القرآن کے حوالے دیتی ہیں، اس لیے کہ دعوتی اور ادبی پہلوؤں سے دونوں میں یکسانیت ہے۔ اسی طرح وہ بعض اوقات تفسیر رازی سے بھی استفادہ کرتی ہیں۔ انھوں نے چوں کہ اپنے زمانے کے مشایخ ازہر سے بھی استفادہ کیا تھا، اس لیے اپنی تفسیر میں وہ ان کے بھی حوالے دیتی ہیں۔

چہارم: حروفِ مقطعات کے ضمن میں انھوں نے اعجازِ قرآن کی جانب توجہ دلائی ہے اور تقریبِ معنیٰ کے لیے مثالیں دی ہیں اور تشبیہات پیش کی ہیں۔ چنانچہ انھوں نے حروف مقطعات کے سلسلہ میں علماء کے مختلف اقوال بیان کرنے کے بعد سید قطب کا قول قبول کیا ہے کہ یہ تحدّی اور اعجاز کے لیے آئے ہیں۔ وہ کہتی ہیں:

> ''حروف مقطّعات سے اس بات کی طرف اشارہ ملتا ہے کہ یہ کتاب ایسے ہی حروف سے مرکب ہے جو عرب مخاطبین کی دست رس میں تھے۔ اس میں ایسا ہی اعجاز ہے جیسا اللہ کی دیگر مخلوقات کے معاملے میں ہے۔ مٹی مختلف ذرّات کا مجموعہ ہوتی ہے، ان سے لوگ کچی یا پکی اینٹ بناتے ہیں، لیکن اللہ تعالی نے ان سے انسان کو پیدا کیا ہے، جو ایک زندہ مخلوق ہے۔ اسی طرح قرآن حروف اور کلمات کا مجموعہ ہے۔ انسان ان حروف اور کلمات سے اپنے کلام بناتے ہیں اور اللہ تعالی نے ان سے قرآن اور فرقان بنایا ہے۔ ۲۶؎

پنجم: انھوں نے اپنی تفسیر میں عورتوں کے حقوق کا دفاع کیا ہے اور غلط رسوم و روایات کو ترک کرنے کی دعوت دی ہے۔ وہ کہتی ہیں کہ عورتوں کو قرآن میں مذکور ان کے شرعی حقوق ملنے چاہییں۔ مثلاً جس عورت کے شوہر کا انتقال ہو گیا ہو اس کی عدت قرآن نے چار ماہ دس دن بیان کی ہے، لیکن حاملہ کی عدت وضعِ حمل ہے۔ چنانچہ وہ لکھتی ہیں کہ اگر بیوی حاملہ ہو اور شوہر کی وفات کے چند دن بعد ہی اس کے یہاں ولادت ہو

جائے تو اسے یہ حق ملنا چاہیے کہ اگر وہ چاہے تو اس کے فوراً بعد اپنا دوسرا نکاح کر سکتی ہے اور اس کے لیے جائز ہے کہ وہ غم و حزن کا لباس اتار کر زیب و زینت اختیار کرے۔جیسا کہ سورۂ بقرہ کی آیت ۲۳۴ میں مذکور ہے۔اس کے بعد وہ حضرت سبیعہ الاسلمیہؓ کے واقعہ سے استدلال کرتی ہیں،جنھیں رسول اللہ ﷺ نے اجازت دی تھی کہ وضعِ حمل کے بعد دوسرا نکاح کر سکتی ہیں۔۲۷؎ آخر میں لکھتی ہیں:

> ''کوئی عورت چاہے تو سال دو سال یا عمر بھر صبر کرے اور دوسرا نکاح نہ کرے،لیکن ضابطہ یہ ہے کہ وہ وضعِ حمل کے بعد فوراً دوسرا نکاح کر سکتی ہے۔اللہ اور اس کے رسول نے اس کی اجازت دی ہے۔'' ۲۸؎

ششم: انھوں نے اپنی تفسیر میں لغوی مسائل اور فقہی اور مسلکی اختلافات سے گریز کیا ہے اور دعوتی پہلوؤں پر خاص توجہ کی ہے۔احکام کے سلسلہ میں وہ عام معنیٰ بیان کرنے پر اکتفا کرتی ہیں۔مثلاً حَافِظُوا عَلَى الصَّلَوَاتِ وَالصَّلاَةِ الْوُسْطَى (البقرۃ:۲۳۸) کی تشریح کرتے ہوئے کہتی ہیں:

> ''الصَّلاَةِ الْوُسْطَى سے مراد کون سی نماز ہے؟ اس سلسلہ میں مختلف اقوال ہیں۔یہاں اختلافات کو بیان کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اسے متعین طور سے اس لیے نہیں بیان فرمایا،تاکہ مسلمان تمام نمازوں کی حفاظت کریں۔'' ۲۹؎

ہفتم: وہ آیاتِ قرآنی کا سیاق بیان کرتی ہیں اور انھیں حالاتِ حاضرہ سے جوڑتی ہیں۔مثلاً آیتِ ربا کے بعد ایک آیت ہے: وَآتُوا الزَّكَاةَ (البقرۃ:۲۷۷)۔ اس کی تشریح میں لکھتی ہیں:

> ''سودی نظام اب عام ہو گیا ہے اور زکوۃ سے لوگوں نے دوری اختیار کر لی ہے۔گویا کہ یہ صرف انفرادی مسئلہ ہے۔اب زکوۃ کی ادائیگی صرف نیک لوگ ہی کرتے ہیں،اعلانیہ بھی اور چھپ کر بھی۔اس کے برعکس سودی نظام تیزی سے فروغ پا رہا ہے۔'' ۳۰؎

زینب غزالی کی تفسیر کا دعوتی آہنگ

زینب غزالی کی تفسیر کا اصل رنگ دعوتی ہے۔ وہ آیات کی تشریح و توضیح میں دعوتی پہلو کو نمایاں اور قرآن کریم کے احکام و معنی کو موجودہ حالات سے مربوط کرتی ہیں، تاکہ ان کے ذریعہ معاشرہ کے امراض کا علاج ہو سکے۔ مثلاً آیت اِنَّ اللّٰہَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَومٍ حَتّٰی یُغَیِّرُ وا مَابِاَنفُسِھِم (الرعد:۱۱) کی تفسیر میں لکھتی ہیں:

> ''امت مسلمہ سچائی کے ساتھ اللہ کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت پر عمل کر رہی تھی۔ لیکن جب اس کا رویہ بدل گیا، وہ کتاب وسنت کے بغیر اپنے فیصلے کرنے لگی، اس نے کفار کی اتباع کی اور ان کی روش اختیار کی تو اللہ تعالی نے اسے ذلیل وخوار کر دیا اور اسے ایسا بنا دیا کہ وہ ذلت بھری غلامی کی زندگی گزارنے لگی، اس نے اپنے معاملات دوسروں کے ہاتھ میں دے دیے۔ اگر وہ توبہ کرتی، اپنے رب کی طرف رجوع کرتی، اس کے دین کو قائم کرتی، اپنے آپ پر اعتماد کرتی، اللہ کی کتاب کو اپنے درمیان حکم بناتی اور اس کے رسول کی سنت کی پیروی کرتی تو اللہ اسے اس کا کھویا ہوا وقار لوٹا دیتا اور اس کی عزت و شرف کی حفاظت کرتا۔''۳۱

ایک مسلم خاندان کو عقیدہ اور اخلاق کے کس معیار پر فائز ہونا چاہیے؟ اس کی وضاحت کرتے ہوئے آیت وَلَا تَنکِحُوا الْمُشْرِکَاتِ (البقرہ: ۲۲۱) کی تشریح کے تحت لکھتی ہیں:

> '' ایک مسلم کے لیے حرام ہے کہ وہ بتوں کی پرستش کرنے والے مشرکین سے نکاح کرے۔ اس کا اطلاق مسلمان مرد اور مسلمان عورت دونوں پر ہوتا ہے، اگرچہ مسلمان مرد کے لیے کتابیہ عورت سے نکاح جائز ہے۔ لیکن مجھے تعجب ہے ایسے مسلمان مردوں پر جو

دین کے دشمن پر اپنی عزیز ترین اولاد کے لیے بھروسہ کرتے ہیں اور کتابیہ (یہودی یا عیسائی) عورت سے نکاح کرکے اپنی اولاد کو شدید فکری آزمائش سے دوچار کرتے ہیں ، جب وہ دیکھے گی کہ ان کی والدہ چرچ اور والد مسجد کا رخ کرتے ہیں۔''۳۲؎

وہ ان اسلامی فرائض کے احیاء کی طرف پر زور طریقے سے دعوت دیتی ہیں، جو امت کے درمیان سے غائب ہو چکے ہیں ۔ مثلاً آیت: **وَمَن لَّمْ يَحْكُم بِمَا أَنزَلَ اللّٰهُ فَأُولَـٰئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ** (المائدۃ: ۴۴) کے سلسلہ میں فرماتی ہیں:

''یہ آیت بنی اسرائیل کے سیاق میں ہے۔ یہاں ہمیں تھوڑی دیر رک کر سوچنا چاہیے کہ بنی اسرائیل کے لیے اللہ تعالی نے جو احکام نازل کیے تھے، ان پر عمل نہ کرنے کی صورت میں اس نے ان پر کفر کا حکم لگایا تھا تو امت مسلمہ اگر ان احکام پر عمل نہیں کرے گی تو کیا اس کے بارے میں یہ حکم نہ ہوگا۔''۳۳؎

اسی طرح آیت: **وَقَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللّٰهِ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوا إِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِينَ** (البقرۃ: ۱۹۰) کی تفسیر میں لکھتی ہیں:

''اللہ تعالی نے واضح انداز میں فرمایا ہے کہ مسلمانوں کے جو حقوق ان کے دشمنوں کے ذریعہ غصب کیے جا رہے ہیں اور ان کے دیار اور اموال پر قبضہ کیا جارہا ہے، اس کا ازالہ صرف اس صورت میں ممکن ہے کہ اللہ کی راہ میں جہاد کیا جائے اور ان تمام قوتوں کا مقابلہ کیا جائے جو اسلام اور مسلمانوں کے ساتھ برائی کا ارادہ رکھتی ہیں ۔آج مسلمان دین کے معاملہ میں جس آزمائش میں مبتلا ہیں اور ان کے معاملات انتشار کا شکار ہیں، اس کی وجہ یہی ہے کہ انھوں نے اس فریضہ کو ترک کر دیا ہے۔''۳۴؎

زینب غزالی کے تفسیری منہج کی ایک جامع مثال یہ ہے کہ انھوں نے آیت:

مَثَلُ الَّذِیْنَ یُنفِقُونَ أَمْوَالَھُمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ۔۔۔ (البقرۃ:۲۶۱) کی تشریح میں لکھا ہے:

''اس آیت سے لے کر سورہ کے اختتام تک جو مضامین بیان کیے گئے ہیں، ان کے درمیان ایک عمدہ ربط پایا جاتا ہے۔ سب سے پہلے انفاق فی سبیل اللہ کا حکم دیا گیا ہے، پھر سود سے بچنے کی تاکید کی گئی ہے، پھر قرض کے لین دین اور اس سے متعلق معاملات، مثلاً گواہی، کتابت، رہن وغیرہ کا حکم دیا گیا ہے۔ اس طرح قرآن واضح کرتا ہے کہ مال انسانی زندگی کا سہارا اور اس کی زینت ہے اور انسان کا اس سے بنیادی تعلق ہے۔ اس لیے مال سے اس کے ربط کو اعتدال و توازن پر قائم کرنے کی ہدایت دی گئی ہیں۔'' ۳۵؎

(۳) حنان لحام

حنان لحام کی شخصیت سے متعلق زیادہ معلومات نہیں ہیں۔ صرف اتنا پتا چلتا ہے کہ وہ شام کی ایک فاضل خاتون ہیں۔ ان کا ایک بھرا پرا خاندان ہے، جو بیٹوں اور پوتوں پر مشتمل ہے۔ وہ پیشۂ تدریس سے وابستہ ہیں اور تحقیق و تصنیف سے بھی دلچسپی رکھتی ہیں۔ ان کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کا واحد ذریعہ ان کی تالیفات ہیں۔ اپنی کتابوں کے مقدموں میں انھوں نے اپنی شخصیت سے متعلق کچھ معلومات دی ہیں۔ ان سے پتا چلتا ہے کہ وہ علم دوست خاتون ہیں، دوسروں سے فائدہ حاصل کرتی اور دوسروں کو فائدہ پہنچاتی ہیں۔ وہ موجودہ دور میں امت کے مسائل و مشکلات پر نظر رکھتی ہیں اور ان سے بچ نکلنے کی تدابیر سے بحث کرتی ہیں۔ ان کی کتابوں کو پڑھنے سے قاری کو بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے کہ وہ ایسی ادیبہ ہیں، جو سیّال قلم رکھتی ہیں۔ انھوں نے کافی عرصہ مکہ مکرمہ میں گزارا۔ ان کی شخصیت میں صبر اور تحمل و برداشت کی خصوصیات بہت نمایاں ہیں۔ انھوں نے ان لوگوں کی پروا نہیں کی، جنھوں نے انھیں تفسیر میں کچھ لکھنے سے منع کیا اور مشورہ دیا کہ وہ صرف ادبی قصے لکھتی رہیں۔ اپنی کتاب من ھدی

سورۃ آل عمران کے مقدمہ میں انھوں نے بیان کیا ہے کہ تفسیر کے میدان میں ان کا داخلہ کیسے ہوا؟ انھوں نے لکھا ہے:

''بیس سال سے بھی پہلے کی بات ہے، جب میں نے دمشق میں اجتماعی مطالعۂ قرآن کے ہفتہ واری پروگرام میں شرکت کی۔ اس کا انعقاد کچھ خواتین کرتی تھیں۔ بہن لیلیٰ سعید اس میں تفسیر پیش کرتی تھیں۔ میں اسے بہت توجہ سے سنتی تھی اور اسے اپنی ڈائری میں نوٹ بھی کر لیا کرتی تھی، پھر بعد میں بھی اس کا مطالعہ کرتی تھی۔ اس لیے کہ ان کے درس میں کچھ افکار ایسے سامنے آتے تھے جن کو میں نے اس سے پہلے کسی تفسیر میں نہیں پڑھا تھا۔ لیلیٰ سعید نے ہم سے بیان کیا کہ وہ درس میں جو کچھ بیان کرتی ہیں وہ دراصل سالوں پر محیط ان یومیہ تفسیری مجلسوں کا ثمرہ تھا، جسے ان کے بھائی جودت سعید پیش کرتے تھے۔ اجتماعی مطالعۂ قرآن کا یہ پروگرام برابر جاری رہا، باوجود اس کے کہ لوگ اس عمل کو ہلکا اور نامناسب سمجھتے تھے۔ ہم نے ان کی باتوں کی کوئی پروا نہ کی۔ میں ان افکار کو ضبطِ تحریر میں لاتی رہی۔ اس سے مجھے بڑا فائدہ ہوا۔ ایک موقع ایسا آیا کہ بہن لیلیٰ اپنے شوہر کے پاس چلی گئیں، جو جرمنی میں اعلیٰ تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ انھوں نے مجھے یہ ذمہ داری دی کہ میں یہ تفسیری سلسلہ جاری رکھوں۔ میں اپنے نوٹس کی مدد سے اور مزید تین تفاسیر: تفسیر ابن کثیر، سید قطب کی فی ظلال القرآن اور تفسیر المنار کے ذریعہ درس دیتی تھی۔ ان تفسیری نکات کے علاوہ شیخ مالک بن نبی، مولانا ابو الاعلیٰ مودودی، اور ڈاکٹر محمد اقبال وغیرہ کے افکار سے بھی مدد لیتی تھیں۔ میرے حاشیۂ خیال میں بھی نہ تھا کہ یہ نوٹس کبھی تفسیر کے موضوع پر چند کتابوں کی بنیاد بنیں گے۔ کچھ عرصہ کے بعد میں مکہ مکرمہ منتقل ہوگئی۔ وہاں میں نے نئے سرے سے لیکچرس کا سلسلہ

شروع کیا۔ میں نے قرآن کی تین سورتوں کی تفسیر کی: سورۂ بقرہ، سورۂ آل عمران اور سورۂ نسائ۔'' ۳۶؎

حنان لحام نے قرآنی موضوعات پر بہت سی کتابیں تصنیف کی ہیں۔ یہ کتابیں انھوں نے سلسلہ نظرات فی کتاب اللہ کے تحت شائع کی ہیں۔ ان کے نام درج ذیل ہیں:

۱۔ أضواء علی سورۃ یس ۲۔ أضواء و تأملات من سورۃ طہ ۳۔ أضواء من سورۃ لقمان ۴۔ من ھدی سورۃ البقرۃ ۵۔ من ھدی سورۃ آل عمران ۶۔ من ھدی سورۃ النساء ۷۔ من ھدی سورۃ النور ۸۔ تفسیر سورۃ التوبۃ ۳۷؎

انھوں نے قصص کے موضوع پر بھی متعدد کتابیں لکھی ہیں، جن میں سے کئی کتابیں قرآنی تعلیمات پر مبنی ہیں:

۱۔ لیلۃ القدر ۲۔ سورۃ الاخلاص ۳۔ سورۃ الکوثر
۴۔ قصۃ الفیل ۵۔ العادیات ۶۔ ذی القرنین

حنان لحام کی تفسیر کی خصوصیات اور منہجِ تفسیر

حنان لحام کی تفسیری خصوصیات اور ان کے منہجِ تفسیر کو درج ذیل نکات میں بیان کیا جا سکتا ہے:

اول: وہ قرآنی آیات کی توضیح وتشریح کے لیے ماثور پر اعتماد کرتی ہیں۔ چنانچہ وہ آیات کی تفسیر میں دیگر آیات اور احادیثِ نبوی پیش کرتی ہیں۔ مثلاً آیت: أَمْ تُرِيدُونَ أَن تَسْأَلُوا رَسُولَكُمْ كَمَا سُئِلَ مُوسَىٰ مِن قَبْلُ (البقرۃ:۱۰۸) کی تشریح کرتے ہوئے کہتی ہیں:

''ممکن ہے کہ آیت میں نہی، معجزات کا مطالبہ کرنے سے ہو، جیسا کہ یہود کہتے تھے: يَا مُوسَىٰ لَن نُّؤْمِنَ لَكَ حَتَّىٰ نَرَى اللَّهَ جَهْرَةً (البقرۃ:۵۵) یا ممکن ہے کہ نہی تمام سوالات کرنے سے ہو، جیسا کہ

اس آیت میں کہا گیا ہے: یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ آمَنُوا لاَ تَسْأَلُوا عَنْ أَشْیَاءَ إِن تُبْدَ لَکُمْ تَسُؤْکُم (المائدۃ:۱۰۱)۔ یہی بات ایک حدیث میں بھی کہی گئی ہے کہ: ''زیادہ سوال سے بچو، کیونکہ تم سے پہلے کی قومیں کثرتِ سوال اور اپنے انبیاء سے اختلافات کی صورت میں ہلاک کردی گئیں۔ لہٰذا جن باتوں کا تمھیں حکم دیا جائے، انھیں بقدر استطاعت بجا لاؤ اور جن چیزوں سے روکا جائے ان سے رک جاؤ۔'' ۳۸؎

دوم: ان کی تفسیر میں ادبی رنگ نمایاں ہے۔ اس لیے کہ انھیں ادب کا خاص ذوق حاصل تھا۔ تفسیر میں بھی ان کا یہ اسلوب جا بجا ملتا ہے۔ نہ صرف الفاظ کی تشریح میں ادبی جھلک نظر آتی ہے، بلکہ دیگر مواقع پر بھی وہ مؤثر اسلوب میں معانی و مفاہیم کی وضاحت کرتی ہیں۔ ایسا خاص طور پر سورتوں کے مقدمات میں دکھائی دیتا ہے۔

سوم: ان کی تفسیر کا منہج موضوعی ہے۔ وہ ایک سورت کو موضوع کے اعتبار سے کئی اجزاء میں تقسیم کرتی ہیں، پھر ہر موضوع کی آیات کو ایک جگہ جمع کر کے ایک عنوان کے تحت ان کی تشریح کرتی ہیں۔ مثلاً سورۂ آل عمران کی تفسیر انھوں نے چھ فصول کے تحت کی ہے: (۱) کتابِ الٰہی (۲) کتابِ الٰہی کے مخاطبین (۳) اہلِ ایمان کے لیے ہدایت (۴) غزوۂ احد (۵) یہود کا کردار (۶) اولوا الالباب کون ہیں؟۔ اس طرح کی موضوعاتی تقسیم انھوں نے دیگر سورتوں میں بھی کی ہے۔

چہارم: اپنی تفسیر میں وہ معاشرتی مسائل کا تذکرہ کر کے ان کا حل پیش کرتی ہیں۔ مثلاً قرآن کی آیت: لاَ تَحْسَبَنَّ الَّذِیْنَ یَفْرَحُونَ بِمَا أَتَوا وَّیُحِبُّونَ أَن یُحْمَدُوا بِمَا لَمْ یَفْعَلُوا فَلاَ تَحْسَبَنَّھُمْ بِمَفَازَۃٍ مِّنَ الْعَذَابِ (آل عمران:۱۸۸) کی تفسیر میں انھوں نے سید قطب شہید اور شیخ رشید رضا کے حوالہ سے مدح کے نقصانات بیان کیے ہیں اور چند احادیث پیش کی ہیں، جن میں اپنے کاموں پر دوسروں سے تعریف سننے کی خواہش رکھنے سے منع کیا گیا ہے، تاکہ اخلاص باقی رہے۔ وہ کہتی ہیں:

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے مدح سے منع کیا ہے، کیونکہ اس سے انسان پر

برے اثرات پڑتے ہیں۔ وہ غفلت کا شکار اور غرور میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ بعض لوگوں کو مدح سے نقصان پہنچتا ہے اور بعض لوگوں کی تعریف سے حوصلہ افزائی ہوتی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کسی چیز پر ابھارنے کے لیے بعض صحابہ کی تعریف کیا کرتے تھے۔ اس لیے یہ معاملہ دقیق ہے اور اس میں حکمت کی ضرورت ہے، تاکہ جہاں ضرورت ہو، تعریف کی جائے اور جہاں ضرورت ہو، تنقید سے کام لیا جائے۔'' ۳۹؎

اسی طرح انھوں نے اپنی تفسیر میں خواتین کے مسائل سے خاص طور سے بحث کی ہے اور ان کو قرآنی تعلیمات کی روشنی میں حل کرنے کی کوشش کی ہے۔ جیسے میراث، عدت، حجاب وغیرہ کے مسائل۔ خاص طور سے انھوں نے سورۂ نساء اور سورۂ نور کی تفسیر میں ان مسائل پر بحث کی ہے۔

پنجم: تفسیر میں اختلافی مسائل سے وہ گریز کرتی ہیں۔ کیوں کہ ان کے نزدیک اس سے ایمان پر کوئی فرق نہیں پڑتا اور یہ محض وقت کا ضیاع ہے۔ چنانچہ آیت: إِذْ قَالَ اللّٰهُ يَا عِيسَى إِنِّي مُتَوَفِّيكَ وَرَافِعُكَ إِلَيَّ (آل عمران: ۵۵) کے تحت ابتدا میں وہ مفسرین کے اقوال نقل کرتی ہیں کہ وفات سے مراد موت ہے یا نیند؟ اور رفع سے مراد صرف روح کے ساتھ اٹھایا جانا ہے یا روح اور جسم دونوں کے ساتھ؟ پھر کہتی ہیں:

''یہ باتیں ہمارے ایمان پر اثر انداز نہیں ہوتیں، کیوں کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے۔ جو لوگ اس آیت کے ضمن میں مذکورہ بحثیں کرتے ہیں وہ صریح دلائل نہیں دیتے۔ وہ لوگ لاحاصل کام میں وقت ضائع کرتے ہیں۔ بہتر تھا کہ ان بحثوں سے اعراض کیا جائے۔'' ۴۰؎

ششم: وہ تفسیر کو موجودہ زمانے کے احوال و مسائل کے ساتھ جوڑتی ہیں۔ مثلاً فَأَمَّا الَّذِينَ كَفَرُوا فَأُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا شَدِيدًا فِي الدُّنْيَا وَالآخِرَةِ (آل عمران: ۵۶) کی تفسیر میں لکھتی ہیں:

''اللہ تعالی نے اس دنیا میں اپنی سنت جاری کر رکھی ہے۔ جو اس کی اتباع کرتا ہے وہ اس کا نتیجہ حاصل کرتا ہے، خواہ وہ کافر ہی ہو۔ اللہ تعالی کی سنت یہ ہے کہ وہ دنیا کا اقتدار ان لوگوں کو عطا کرتا ہے جو اس کی صلاحیت رکھتے ہوں ۔عذاب کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ان سے اقتدار چھین لیا جائے۔موجودہ زمانہ میں مرض ایڈز کا ظہور، جو جدید طاعون کے مثل ہے، عذاب کی ہی ایک صورت ہے، جس میں اللہ تعالی احکامِ الٰہی کا انکار کرنے والوں کو مبتلا کرتا ہے۔'' ۴۱؎

آیتِ مباہلہ (آل عمران:۶۱) میں وَنِسَاءَنَا وَنِسَاءَكُمْ (آل عمران:۶۱) کی معنویت پر وہ شیخ رشید رضا کی رائے سے اتفاق رکھتی ہیں کہ اس سے معاشرہ میں عورت کے مقام و مرتبہ کا ظہور ہوتا ہے۔اسی طرح آیت: وَلْتَكُن مِّنكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُونَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ (آل عمران: ۱۰۴) کی تفسیر میں انھوں نے شیخ رشید رضا کے حوالے سے دس شرائط کا تذکرہ کیا ہے، جن کا داعی میں پایا جانا ضروری ہے۔ ۴۲؎

ہفتم: وہ سائنسی ترقیات کے فہم واستفادہ میں تجدیدی روش اختیار کرنے کی دعوت دیتی ہیں، جیسا کہ انھوں نے سورۂ بقرہ کی تفسیر کے مقدمے میں آیاتِ انفس و آفاق کو گہرائی سے سمجھنے پر زور دیا ہے۔ وہ کہتی ہیں:

''آفاق وانفس کی نشانیوں کے سلسلے میں جو نئی معلومات حاصل ہوئی ہیں، ان سے مناسبت پیدا کرنے کے لیے ہمیں فہم وتفکیر میں تجدید کی ضرورت ہے۔ ہمارے لیے یہ کام آسان نہیں ہے، اس لیے کہ ہم صدیوں تک ایک بند دائرے میں رہے ہیں اور اپنے ارد گرد ہونے والی ترقی سے ہمارا کوئی واسطہ نہیں رہا ہے۔ ہم ہر نئی چیز سے ڈرتے اور اس کا بالکلیہ انکار کرتے ہیں، خاص طور سے علم تفسیر کے معاملے میں۔'' ۴۳؎

وہ تجدید اور تفسیر بالرائی ،جو درحقیقت اتباعِ ہویٰ ہے، کے درمیان فرق کرتی ہیں۔ اس سلسلہ میں انھوں نے علامہ ابن تیمیہؒ کا یہ قول نقل کیا ہے: **ان صریح المعقول لا تخالف صحیح المنقول** (خالص عقلی چیز صحیح منقول چیز کے مخالف نہیں ہوسکتی)۔

ہشتم: وہ تفسیر کرتے ہوئے پہلے یہ بتاتی ہیں کہ سورہ مکی ہے یا مدنی؟ اس میں آیات کی تعداد کیا ہے؟ حدیث میں اس کے کیا فضائل مروی ہیں؟ پھر اسبابِ نزول کی روایات نقل کرتی ہیں۔ مثلاً سورۂ آل عمران کے بارے میں بیان کرتی ہیں کہ یہ غزوۂ بدر کے بعد نازل ہوئی ہے۔ (سورہ کی آیت نمبر ۱۳ میں غزوۂ بدر کی طرف اشارہ موجود ہے۔) اور اس کی آیات غزوۂ احد کے بعد تک نازل ہوتی رہی ہیں۔ ۴۴

نہم: وہ زیرِ تفسیر سورہ اور اس کے پہلے کی سورہ کے درمیان مناسبت اور اختلاف ومماثلت کے پہلوؤں کی وضاحت کرتی ہیں۔ مثلاً سورہ آل عمران کی تفسیر میں لکھتی ہیں:

> ''ہمیں سورۂ آل عمران اور سورۂ بقرہ کے درمیان بعض پہلوؤں میں اختلاف دیکھنے کو ملتا ہے۔ سورۂ بقرہ میں یہود کا مفصّل تذکرہ ہے، جب کہ سورۂ آل عمران میں نصاریٰ سے خطاب زیادہ ہے۔ سورۂ بقرہ زیادہ تر معاشرتی اور معاشی احکام ومسائل پر مشتمل ہے، جب کہ سورۂ آل عمران میں دو خاص موضوعات پر زور ہے: صحیح عقیدہ کا بیان اور اہل کتاب سے مباحثہ اور ان پر تنقید اور اہلِ ایمان سے سرزد ہونے والی غلطیوں پر تنقید۔''

دہم: وہ سورہ کی موضوعاتی اعتبار سے مختلف اکائیوں میں تقسیم کرتی ہیں، پھر ہر اکائی کو ایک خاص عنوان دیتی ہیں۔ مثلاً انھوں نے سورۂ آل عمران کو موضوع کے اعتبار سے چھ حصوں میں تقسیم کیا ہے، پھر ہر حصہ کو مضمون کے اعتبار سے ایک خاص عنوان دیا ہے۔

بعض آیات کی تفسیر میں حنان لحام سے اجتہادی آراء ظاہر ہوئی ہیں، جو دیگر

مفسرین اور جمہور علماء کی آراء سے مطابقت نہیں رکھتیں۔ان میں سے ایک عورت کی گواہی کا مسئلہ ہے۔سورۂ بقرہ میں ایک موقع پر دو عورتوں کی گواہی کو ایک مرد کے برابر قرار دیا گیا ہے۔وہاں وہ صاحب تفسیر المنار کے حوالہ سے لکھتی ہیں:

> ''بھٹکنا اور بھولنا معلومات اور تجربہ کی کمی کی وجہ سے ہوتا ہے۔گواہی کی شرائط یہ ہیں: حادثہ کی جگہ موجودگی، سچائی، امانت، علم وشعور وغیرہ۔اگر یہ شرائط پورے طور پر کسی عورت میں پائی جائیں تو اس کی گواہی بھی مرد کی گواہی کے برابر ہوگی۔ماضی میں بھی فقہاء نے کچھ مخصوص معاملات میں ایک عورت کی گواہی قبول کی ہے، خاص طور سے عورتوں سے متعلق مسائل میں۔گویا اس آیت میں ان مخصوص معاشرتی حالات کا تذکرہ ہے جب عورت کو مالی تنازعات اور قضائی معاملات کی پوری جان کاری نہیں رہتی تھی، لیکن جب گواہی کی تمام شرائط پائی جائیں تو اسے قبول کیا جائے گا، چاہے گواہی مرد کی ہو یا عورت کی۔'' ۴۵؎

حواشی ومراجع:

۱؎ ملاحظہ کیجیے مقالہ بنت الشاطی http://ikhwanonline.com/Article.asp?، مقالہ عائشہ عبدالرحمان بنت الشاطی www.azaheer.org/vb/shoethred.php?

۲؎ ڈاکٹر عائشہ عبدالرحمن بنت الشاطی، التفسیر البیانی للقرآن الکریم، دار المعارف القاھرۃ، جلد ۱، ص ۱۰۔۱۱

۳؎ التفسیر البیانی: ۱/ ۱۱، المقدمۃ

۴؎ مزید ملاحظہ کیجیے: مریم: ۷۷۔۸۷، الفرقان: ۴۳، الجاثیۃ: ۲۳، النجم: ۳۳۔۳۸

۵؎ مزید ملاحظہ کیجیے: یونس: ۵۹، الشعرائ: ۷۵، فاطر: ۴۰، الزمر: ۳۸، النجم: ۱۹، الاحقاف: ۴

۶؎ التفسیر البیانی: ۲/ ۲۷۔۲۹

۷؎ حوالۂ سابق: ۱/ ۱۴۔۱۵

۸۔ ملاحظہ کیجیے: الاعجاز البیانی للقرآن الکریم ومسائل ابن الازرق، دار المعارف القاھرۃ، ۱۹۷۱ئ، ص ۱۲۲۔ ۱۲۳ (المبحث الثانی: رأی فی الاعجاز)

۹۔ التفسیر البیانی کا مقدمہ، ص ۲۔۹

۱۰۔ ملاحظہ کیجیے التفسیر البیانی: ۱/ ۱۶۷، ۱۹۵، الاعجاز البیانی، ص ۱۹۳۔ ۲۱۰

۱۱۔ التفسیر البیانی: ۲/ ۴۶، الاعجاز البیانی، ص ۱۷۰۔ ۱۷۶

۱۲۔ صلاح عبدالفتاح الخالدی، البیان فی اعجاز القرآن، دار عمار، عمان، الاردن، ص ۱۴۷

۱۳۔ الاعجاز البیانی للقرآن الکریم، ص ۱۲۶۔ ۱۶۷

۱۴۔ التفسیر البیانی: ۲/ ۸

۱۵۔ حوالۂ سابق: ۱/ ۱۶

۱۶۔ حوالۂ سابق: ۱/ ۳۲

۱۷۔ ملاحظہ کیجیے مقدمۂ تفسیر، ص ۱۷۔ ۱۸

۱۸۔ التفسیر البیانی: ۲/ ۱۷۵

۱۹۔ حوالۂ سابق: ۲/ ۴۵۔ ۴۶

۲۰۔ ملاحظہ کیجیے مقدمہ التفسیر البیانی: ۲/ ۸۔ ۹

۲۱۔ التفسیر البیانی: ۲/ ۱۸

۲۲۔ ملاحظہ کیجیے زینب غزالی کے حالاتِ زندگی انٹرنیٹ پر، اسلام اون لاین، اخوان اون لاین

۲۳۔ الحمد للہ تفسیر کی دوسری جلد بھی حال میں شائع ہوگئی ہے۔ اس طرح زینب غزالی ان خواتین میں شامل ہوگئی ہیں جنھیں مکمل قرآن کی تفسیر لکھنے کا شرف حاصل ہے۔ (مترجمہ)

۲۴۔ ملاحظہ کیجیے: زینب الغزالی الجبیلی، نظرات فی کتاب اللہ، دار الشروق القاھرۃ، ۱۹۹۴ئ، ص ۱۸۹۔ ۱۹۰

۲۵۔ حوالہ سابق، ص ۲۰۔ ۲۱

۲۶۔ حوالہ سابق، ص ۱۹۔ ۲۰

۲۷۔ صحیح بخاری، کتاب المغازی، باب فضل من شھد بدراً، حدیث: ۳۷۷۰، صحیح مسلم، کتاب الطلاق، باب انقضاء عدۃ المتوفی عنھا زوجھا وغیرھا بوضع الحمل، حدیث: ۶۴۸۴

۲۸۔ ملاحظہ کیجیے نظرات فی کتاب اللہ، ص ۱۴۱۔۱۴۲

۲۹۔ حوالہ سابق، ص ۱۴۵

۳۰۔ حوالہ سابق، ص ۱۷۸

۳۱۔ حوالہ سابق، ص ۶۸۴

۳۲۔ حوالہ سابق، ص ۱۳۳۔۱۳۴

۳۳۔ حوالہ سابق، ص ۳۷۹۔۳۸۰

۳۴۔ حوالہ سابق، ص ۱۰۰۔۱۱۴

۳۵۔ حوالہ سابق، ص ۱۶۳۔۱۶۵

۳۶۔ ملاحظہ کیجیے: حنان لحام، من ھدی سورۃ آل عمران، دار الھدی للنشر و التوزیع الریاض، ۱۹۸۹ئ، مقدمہ، ص ۵۔۶

۳۷۔ حنان لحام، ھدی السیرۃ النبویۃ فی التغییر الاجتماعی، دار الفکر دمشق، ۲۰۰۱، المقدمۃ، ص ۱۵

۳۸۔ صحیح مسلم، کتاب الحج، باب فرض الحج مرۃ فی العمر، حدیث: ۱۳۳۷

۳۹۔ ملاحظہ کیجیے: حنان لحام، من ھدی سورۃ آل عمران، ص ۲۳۹

۴۰۔ حوالۂ سابق، ص ۷۳۔۷۴

۴۱۔ حوالۂ سابق، ص ۷۵۔۷۶

۴۲۔ حوالۂ سابق، ص ۷۹

۴۳۔ حنان لحام، من ھدی سورۃ البقرۃ، دار الھدی للنشر والتوزیع الریاض، ۱۹۸۹ء، ص ۵۔۶

۴۴۔ من ھدی سورۃ آل عمران، ص ۹۔۱۰

۴۵۔ حنان لحام، تأملات فی منزلۃ المرأۃ فی القرآن الکریم، ص ۸۸۔۹۰

ماخذ:

مجلۃ کلیۃ الشریعۃ والدراسات الاسلامیۃ، جامعۃ قطر

شمارہ ۲۵، ۱۴۲۸ھ/ ۲۰۰۷ء

تعارف وتبصرہ

نسائیات (چندفکری ونظری مباحث) **ڈاکٹر محمد شکیل اوج**

ناشر: فیکلٹی آف اسلامک اسٹڈیز، کراچی یونی ورسٹی کراچی،طبع اول: جون ۲۰۱۲ئ، صفحات ۳۰۶، قیمت -/۵۰۰ روپے پاکستانی۔

زیرنظر کتاب خواتین کے بارے میں چندفکری ونظری مقالات کا مجموعہ ہے۔ یہ مقالات سہ ماہی التفسیر کراچی، ماہ نامہ معارف اعظم گڑھ اور دیگر علمی مجلّات میں وقتاً فوقتاً شائع ہوتے رہے ہیں۔ ان میں خواتین سے متعلق عصری معاشرتی مسائل پر بحث کے لیے قرآن حکیم کو بنیاد بنایا گیا ہے۔ تائید میں مفسرین، محدثین، فقہاء اور ماہرین لغت کی آراء پیش کی گئی ہیں۔

اس کتاب میں بیس مقالات شامل ہیں۔ ان میں نکاح وطلاق میں زوجین کے حقوق، کم سنی کی شادی، پسند کی شادی، جہیز کی رسم، تعدّدِ ازدواج، مسیار میرج (نکاح کی وہ صورت جس میں بیوی کے نان ونفقہ کی ذمہ داری سے شوہر آزاد ہوتا ہے) بیواؤں کی شادی، سوکن کا تصور، اہل کتاب مرد سے مسلم عورت کا نکاح، مروّجہ حلالہ، خلع اور فسخ نکاح میں عدالت کا کردار، تفویض طلاق، باندیوں سے تمتع یا نکاح؟ حق حضانت، عورتوں کا نصاب شہادت، چہرے کا پردہ، نیل پالش کے ساتھ وضو، مہر اور عورتوں کا سفرحج جیسے مسائل پر تحقیقی انداز سے بحث کی گئی ہے۔

بعض مسائل میں فاضل مصنف نے بہت عمدہ بحث کی ہے اور تحقیق کا حق ادا کیا ہے، مثلاً جہیز، تعدد ِازدواج، نکاحِ بیوگان، حضانت، حلالہ اور مہر وغیرہ۔ البتہ بعض مسائل ابھی مزید غور وخوض کے متقاضی ہیں۔ یہ وہ مسائل ہیں جن میں انھوں نے جمہور امت سے ہٹ کر موقف اختیار کیا ہے، مثلاً نابالغ لڑکی کا نکاح ان کے نزدیک اسلامی تعلیمات کی رؤ سے جائز نہیں ہے۔ قرآن میں ان عورتوں کی عدّت بھی بیان کی گئی ہے جنھیں ابھی حیض نہ آیا ہو

(الطلاق: ۴) لیکن وہ کہتے ہیں کہ اس سے مراد وہ لڑکیاں نہیں ہیں جنھیں کم عمری کی وجہ سے حیض نہ آیا ہو، بلکہ وہ لڑکیاں ہیں جو بلوغت کی عمر کو پہنچ گئی ہوں، لیکن کسی مرض کے سبب انھیں حیض نہ آیا ہو (ص ۴۲-۴۵) قرآن نے صراحت کی ہے کہ مسلمان مرد اہل کتاب عورت سے نکاح کرسکتا ہے (المائدہ: ۵) لیکن مسلمان عورت کے اہل کتاب مرد سے نکاح کے مسئلے پر وہ خاموش ہے، اس بنا پر علماء نے اسے ناجائز کہا ہے، لیکن مصنف نے مختلف قرائن سے اسے جائز قرار دینے کی کوشش کی ہے۔ فقہائے امت نے تفویض طلاق (یعنی شوہر اپنا حقِ طلاق بیوی کو دے دے) کو قانونی طور پر تسلیم کیا ہے، لیکن مصنف کے نزدیک ناجائز اور الٰہی شریعت میں تبدیلی کے مترادف ہے (ص: ۱۳۰) عہد نبوی میں جنسی تعلق کے جواز کی دو صورتیں تھیں: ایک آزاد عورتوں سے نکاح اور دوسری باندیوں کا ملک یمین میں ہونا۔ بعد کے ادوار میں بھی اس پر عمل ہوتا رہا، لیکن مصنف نے دعویٰ کیا ہے کہ باندیوں سے جنسی تعلق بغیر نکاح کے جائز نہیں ہے، اس کی اجازت نہ قرآن وحدیث میں دی گئی ہے اور نہ اسلامی تاریخ کے کسی دور میں اس پر عمل ہوا ہے۔ (ص ۱۶۳-۲۱۴) اس طرح کے اور بھی تفردات اس کتاب میں پائے جاتے ہیں، لیکن ان پر محاکمہ کی اس مختصر تبصرے میں گنجائش نہیں ہے۔

ایک جگہ مصنف نے دعویٰ کیا ہے کہ اسلام میں 'سوکن' کا کوئی تصور نہیں پایا جاتا۔ اس سے متعلق ساری کہاوتیں اور محاورے ہندوستانی معاشرہ کے عکاس ہیں، وہ عربی زبان و ادب میں نہیں ملیں گے (ص ۸۳-۸۴) یہ بات بھی صحیح نہیں ہے۔ یہ ایک فطری نسوانی جذبہ ہے، جس کا اظہار ہر علاقہ، ہر زمانہ اور ہر زبان میں ہوتا رہا ہے۔ عربی زبان میں اس کے لیے لفظ 'ضرّۃ' آتا ہے۔ اس سے متعلق متعدد استعمالات اور محاورات کلامِ عرب میں پائے جاتے ہیں۔

مصنف نے اس کتاب میں جو مسائل چھیڑے ہیں اور ان میں ان کے جو تفردات پائے جاتے ہیں، ضرورت ہے کہ ان کا تنقیدی جائزہ لیا جائے۔

(محمد رضی الاسلام ندوی)

دارالمصنفین کی عربی خدمات ڈاکٹر محمد عارف عمری

ناشر: ادبی دائرہ، رحمت نگر، اعظم گڑھ، ۲۰۱۳ئ، صفحات: ۲۷۲، قیمت -/۳۰۰ روپے

دارالمصنفین اعظم گڑھ کی تاسیس پر ایک صدی ہونے والی ہے، اس عرصے میں اس ادارہ نے اسلامیات، تاریخ، سوانح، ادب اور تنقید وغیرہ کے موضوعات پر بڑی وقیع کتابیں شائع کی ہیں اور بحث وتحقیق کے میدان میں اسے عالمی سطح پر اعتبار واستناد حاصل ہے۔ اس کا بیش تر کام یوں تو اردو زبان میں ہے، لیکن کچھ کتابیں اس نے عربی زبان میں بھی شائع کی ہیں یا اس کے تحت عربی کتابوں کے اردو ترجمے ہوئے ہیں۔ دارالمصنفین کی گراں قدر خدمات کے مطالعہ وجائزہ پر متعدد کتابیں شائع ہوچکی ہیں۔ ان میں پروفیسر خورشید نعمانی کی کتاب 'دارالمصنفین کی تاریخ اور علمی خدمات' (دوجلدیں) اور ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی کی کتاب 'دارالمصنفین کی تاریخی خدمات' خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ لیکن عربی زبان میں اس کی خدمات کا الگ سے جائزہ اب تک نہیں لیا جاسکا تھا۔ اس کی تکمیل زیر نظر کتاب کے ذریعے ہوئی ہے۔ یہ اصلاً فاضل مصنف کا وہ تحقیقی مقالہ ہے جس پر انھیں ۲۰۰۳ء میں لکھنؤ یونی ورسٹی نے پی ایچ ڈی کی ڈگری تفویض کی تھی۔

کتاب پانچ ابواب پر مشتمل ہے۔ باب اول میں دارالمصنفین کا مختصر تعارف اور اہم علمی کارناموں کا سرسری تذکرہ کیا گیا ہے۔ باب دوم میں دو فصلیں ہیں: فصل اول میں قرآنیات کے موضوع پر شائع ہونے والی کتابوں کا تعارف ہے اور فصل دوم میں ان کتابوں کا تذکرہ ہے جو ادب اور تاریخ کے موضوع پر ہیں۔ تیسرا باب دارالمصنفین کی مطبوعات کے عربی تراجم پر ہے۔ باب چہارم میں 'شعرالعرب' کے عنوان سے مولانا شبلی اور مولانا عبدالسلام ندوی کی تحریروں کا تعارف کرایا گیا ہے اور پانچواں باب عربی کی ان کتابوں کے تعارف پر مشتمل ہے جن کا اردو ترجمہ دارالمصنفین میں ہوا ہے۔ اسی باب میں بہ طور ضمیمہ ان عربی مطبوعات کا بھی تذکرہ کیا گیا ہے جو دارالمصنفین سے شائع تو نہیں ہوئی ہیں، لیکن اس کے اشاعتی منصوبہ میں شامل ہیں۔

فاضل مصنف نے ان کتابوں کی تاریخ اشاعت اور دیگر مطبعی تفصیلات درج کرنے کے علاوہ ان کے مشتملات کا بھی تعارف کرایا ہے اور ان کا عمدہ تجزیہ کیا ہے۔ خاص طور سے مجموعہ تفاسیر ابو مسلم اصفہانی، علامہ شبلی کی کتاب الانتقاد علی تاریخ التمدن الاسلامی، مولانا عبدالعزیز میمنی کی کتاب ابوالعلاء وما الیہ، مولانا فراہی کی تفسیر سورۂ ذاریات کا تجزیاتی مطالعہ بہت مفصل اور تحقیقی ہے۔

مصنف نے اپنے پیش لفظ میں لکھا ہے کہ مولانا محمد اویس ندوی کی مرتب کردہ تفسیر ابن القیم اور مولانا سید سلیمان ندوی کی لغاتِ جدیدہ کا تذکرہ اصل مقالہ میں رہ گیا تھا۔ اس کتاب میں ان کے تعارف کو بھی شامل کر دیا گیا ہے (ص۱۱) اس کے باوجود اب بھی متعدد چیزوں کا تذکرہ رہ گیا ہے۔ مثلاً مولانا عبدالسلام ندوی نے مصری مصنف محمد لبیب البتنونی کے سفر نامۂ حج 'الرحلۃ الحجازیۃ' کا اردو ترجمہ 'تاریخ الحرمین الشریفین' کے نام سے کیا تھا۔ اس پر مولانا سید سلیمان ندوی کا مقدمہ بھی ہے۔ اس کتاب کی اشاعت اگرچہ مطبع معارف سے نہیں ہوئی تھی، بلکہ وہ پنجاب کے ایک اشاعتی ادارہ سے طبع ہوئی تھی، لیکن مولانا عبدالسلام چوں کہ عمر بھر دارالمصنفین سے وابستہ رہے، اس لیے اس کا شمار بھی دارالمصنفین کی عربی خدمات کے دائرہ میں ہونا چاہیے۔ اسی طرح سید سلیمان ندوی نے متعدد عربی کتب پر مبسوط مقدمے لکھے ہیں (مثلاً علامہ ابن تیمیہ کی الرد علی المنطقیین اور ابوالبرکات ہبۃ اللہ البغدادی کی کتاب المعتبر)۔ ان کا بھی تذکرہ آنا چاہیے تھا۔ (ڈاکٹر سطوت ریحانہ نے اپنی کتاب 'عربی زبان وادب کے ارتقاء میں سید سلیمان ندوی کی خدمات' میں سید صاحب کی ایسی تمام تحریروں کو جمع کر دیا ہے)۔ مصنف نے سیرۃ النبی جلد اول کے عربی ترجمے کے ضمن میں اس کی عدم اشاعت کی افسوس ناک داستان بیان کی ہے۔ مقام مسرت ہے کہ اس کے مقدمہ کا عربی ترجمہ جناب محمد علی غوری نے 'فن السیرۃ النبویۃ تاریخ و اصول' کے نام سے کر دیا ہے اور ۲۰۱۱ء میں مرکز جمعۃ الماجد للثقافۃ والتراث دبئی سے اس کی اشاعت ہوگئی ہے۔ علامہ شبلی کی کتاب الفاروق کے عربی زبان میں دو ترجمے ہوئے ہیں: ایک کی اشاعت

دارالسلام ریاض سے (۱۹۹۹ئ) اور دوسرے کی الدارالعربیہ بیروت سے (۲۰۰۴ئ) ہوئی ہے۔ ان کا تذکرہ بھی نہیں آسکا ہے۔ سید سلیمان ندوی کے ایک مقالہ کا عربی ترجمہ 'تحقیق معنی السنۃ و بیان الحاجۃ الیہا' کے نام سے کتابچہ کی صورت میں عالم عرب سے متعدد اشاعتی اداروں مثلاً المکتب الاسلامی بیروت، المطبعۃ السلفیۃ قاہرہ اور دارالفجر دمشق وغیرہ سے شائع ہوا ہے، مگر اس کا تذکرہ بھی مصنف نے نہیں کیا ہے۔

عربی زبان میں دارالمصنفین کی قرآنی مطبوعات کے ضمن میں مصنف نے مولانا فراہی کی تین مطبوعات (تفسیر سورۂ ذاریات، تفسیر سورۂ فیل اور امعان فی اقسام القرآن) کا تفصیلی تعارف کرایا ہے، لیکن معلوم نہیں کیوں ان کے دیگر اجزائے تفسیر (تفسیر سورۂ مرسلات، تفسیر سورۂ عبس، تفسیر سورۂ تین، تفسیر سورۂ کوثر) اور ان کی مایہ ناز تصنیف الرای الصحیح فیمن ہو الذبیح، جن کی اولین طباعت مطبع معارف ہی میں ہوئی تھی، ان کا تذکرہ شاملِ کتاب نہیں ہے۔ تفسیر سورۂ فیل کا تعارف و تجزیہ مصنف نے گیارہ صفحات میں کیا ہے، اس کا خلاصہ آخر میں ان الفاظ میں بیان کیا ہے 'مولانا حمیدالدین فراہی کی تفسیر سورۃ الفیل علم تفسیر میں ایک بیش بہا اضافہ ہے، البتہ اس کے مطالعہ کے وقت متانت وسنجیدگی اور غور و تدبر کی سخت ضرورت ہے۔ بدقسمتی سے زمانہ حال کے بعض محققین نے اس تفسیر کو جارحانہ نقد و تنقید کا موضوع بنایا ہے، جو علم و تحقیق کے ساتھ صریح ظلم و ناانصافی ہے' (ص ۸۸) تفسیر سورۂ فیل میں مولانا فراہی کے نقطۂ نظر سے اختلاف کو متانت وسنجیدگی کی کمی اور قلتِ غور و تدبر کا نتیجہ قرار دینا اور اس پر نقد کو علم و تحقیق کے ساتھ صریح ظلم اور ناانصافی سے تعبیر کرنا علمی سنجیدگی کے خلاف ہے۔ متعدد اصحابِ علم نے اس نقطۂ نظر سے اختلاف کیا ہے۔ ابھی حال میں (۲۰۱۳ئ) یمن کے مشہور عالم دین شیخ علامہ عبدالرحمن بن یحییٰ المعلّمی (م ۱۳۸۶ھ) کی کتاب (رسالۃ فی التعقیب علی تفسیر سورۃ الفیل للمعلم عبدالحمید الفراہی) سعودی عرب سے شائع ہوئی ہے، جس میں انھوں نے اس نقطۂ نظر کا مختلف پہلوؤں سے رد کیا ہے اور اسالیب قرآن کے علاوہ شعرائے جاہلیت کے کلام سے بھی استدلال کیا ہے۔ (م-ر)

خبر نامہ ادارۂ تحقیق وتصنیف اسلامی (۵۲)

☆ الحمدللہ مولانا کمال اختر قاسمی رکنِ ادارہ نے علمی منصوبہ کے تحت متعین کردہ موضوع 'امنِ عالم اور اسلام' پر اپنا کام مکمل کرکے ادارہ کے حوالے کردیا ہے۔

☆ ۲۳/ جون ۲۰۱۴ء کو رائٹرس فورم کے تحت منعقدہ پروگرام میں ادارہ کے زیر تربیت اسکالر جناب محمد عارف اعظم قاسمی نے 'اقسام القرآن للفراہی' کا تجزیاتی مطالعہ پیش کیا۔ اخیر میں مقالہ نگار نے شرکاء کے بعض سوالات کے جوابات دیے۔ پروگرام کی صدارت جامعۃ الفلاح اعظم گڑھ کے شیخ التفسیر مولانا محمد اسماعیل فلاحی نے فرمائی۔

☆ ۲۴/ جون ۲۰۱۴ء کو ادارہ کی مجلسِ عام کا اجلاس دہلی میں منعقد ہوا۔ اس میں ادارہ کی سرگرمیوں اور مسائل کا جائزہ لیا گیا۔

☆ ادارہ کی مسجد میں الحمدللہ انگلش میڈیم اسکولس کے بچوں کی دینی تعلیم وتربیت کے لیے ناظرۂ قرآن مجید، دینیات اور اردو زبان کی تدریس کا آغاز کردیا گیا ہے۔ تقریباً چالیس بچے فیض یاب ہورہے ہیں۔

☆ مجلہ تحقیقات اسلامی کی مقبولیت اور علمی حلقوں میں اس کے اعتبار و استناد میں الحمدللہ برابر اضاہ ہورہا ہے۔ ابھی حال میں اطلاع ملی ہے کہ جی سی یونی ورسٹی فیصل آباد (پاکستان) میں جناب کاشف رضا صاحب شعبۂ اسلامیات سے 'تحقیقات اسلامی کا تجزیاتی مطالعہ' کے عنوان سے ایم فل کررہے ہیں۔

پاکستان میں سہ ماہی تحقیقاتِ اسلامی کے لیے رابطہ کریں:

جناب سجاد الٰہی صاحب، 27-A، لوہا مارکیٹ، مال گودام روڈ، بادامی باغ، لاہور

Tel: 0300-4682752, (R)5863609, (O)7280916

Email: abdulhadi_133@yahoo.com

Organ of Idara-e-Tahqeeq-o-Tasneef-e-Islami

Quarterly

TAHQEEQAT-E-ISLAMI

ALIGARH

Vol. 33 No.3

July-September 2014

Editor
Syed Jalaluddin Umari

Asstt. Editor
Mohammad Raziul Islam Nadvi

Nabi Nagar (Jamalpur) P.O. Box: 93
ALIGARH - 202 002 (INDIA)
www.tahqeeqat.net
Email: tahqeeqat@gmail.com

CONTENTS

1. **The Importance of Migration to Madinah in Islamic History** 5
   Maulana Syed Jalaluddin Umari
2. **The Qurayshi Tradition of Mercantile Alliances during the Makkan Period (610-622)** 17
   Prof. M. Yaseen Mazhar Siddiqui
3. **Al-Fatawa Al-Alamgiria: A Basic Source in Al-Musawwa** 41
   Dr. Ziauddin Malik Falahi
4. **Ijtihad and its historical development** 57
   Prof. Mohammad Anas Hassan
5. **Shaikh Muhammad Al-Ghazali and his book Fiqh al-Seerah-An Introduction** 75
   Dr. Safdar Sultan Islahi
6. **Some Female Quran Interpretators in Contemporary era** 89
   Afaf Abdul Ghafoor Hameed
   Tr. Nadeem-e- Sahar Ambareen
7. **Book Reviews** 115
8. **Activities of Idara Tahqee-o-Tasneef-e-Islami** 120

Abstract of the Articles

The Importance of Migration to Madinah in Islamic History

Maulana Syed Jalaluddin Omari
Amir Jamaat-e-Islami Hind
& President Idara-e-Tahqeeq-o-Tasneef-e-Islami, Aligarh

The Arabs used to describe their history, relating it to some major incident. For example, the incident of As-haab al-F?l (People of the Elephants) took place before the Prophet's birth. Therefore, they used to say that a certain incident took place such and such period before or after the incident of As-haab al-F?l. During the regime of Caliph Umar, the need as to which point of time the Islamic calendar should commence and how to calculate its dates was seriously felt. Different opinions came to the fore as a result of suggestions sought from the Companions. Hazrat Umar was of the view that Hijrat (Migration) to Madinah should be made the foundation of Islamic history. Hazrat Ali seconded it. At last, a decision was made to this effect. This is because the Migration to Madinah holds the position of a milestone in the history of Islam.

Though the Muslims were being persecuted in Makkah and they had been passing through a life of trials and tribulations yet the ayaat (verses) being revealed during that period were giving them good tidings of success ahead. Then they were advised to migrate to some place in order to protect their faith if the native land proves hard to them. As a result of this counsel, the Muslims migrated first to Habsha (present

Ethiopia) and finally to Madinah. Towards the end of the Makkan era, Surah Bani Israel was revealed with detailed mention of the background of Migration to Madinah and its impact on the future. As a result of the Migration to Madinah, D?n was perfected, the Muslims got political power, Islam was presented as a global and everlasting D?n, and the Islamic State was introduced as an economically prosperous state.
In this article, a study of these aspects has been made in the light of the Qur'an.

The Qurayshi Tradition of Mercantile Alliances during the Makkan Period (610-622)

Prof. M. Yaseen Mazhar Siddiqui
Ex. Chairman, Dept. of Islamic Studies,
Aligarh Muslim University, ALIGARH
Mmz_Camp@yahoo.in

The mercantile classes all over Arabia and especially Qurayshi tribe of Makkah developed a tradition of making alliances with traders of their towns and other neighbouring dwellings in the Jahili period spanning over at least two centuries before the bi'thah (Prophethood) of Muhammad, apart from making pacts and covenants with the Arabian tribes living on their trade-routes inside Arabia and with adjacent countries they traded in, seeking the protection and cooperation of their rulers and mercantile classes. This legacy of mercantile cooperation led almost all the Traders and Merchants of a city, town or centre to make an understanding with another traders of his dwelling who were called nadim or sharik (partner), raising an individualistic effort to a joint enterprise of two merchants, and at times to a limited company Merchants engaged in national or international trade

were naturally compelled to make agreements of mutual protection and cooperation with other towns like Makkah, Yathrib and Taif etc., they protected their mercantile activities as well as their life and family in their respective regions. Qurayshi traders in particular were leaders and trend-setters who not only consolidated these mercantile pacts but also utilised them for social understanding by making matrimonial relationship with their trade-partners in various centres of their activity. This study aims at focusing attention on the continuation of this mercantile activity in the Makkan period of the Prophet.

Al-Fatawa Al-Alamgiria: A Basic Source in Al-Musawwa

Dr.Ziauddin Malik Falahi
Guest Faculty, Dept. of Islamic Studies
Aligarh Muslim University,Aligarh
Ziauddin malik falahi@gmail.com

Imam Malik (d. 795), Aurangzeb Alamgir (1707) and Shah Wali Allah (1762) are the three milestones in the field of Muslim Law. This noble work produced a continuous chain between the heartland of Islam: Al-Madina and the heartland of the Sub- Continen Dilli . In this work juristic exercise, legal discourses and contemporary sensibilities have been an evident proof running over 13 centuries i.e. 795 to 1707 C.E.

The paper strives to pronounce that a monumental manuscript like Musawwa reaped its maturity and reached a place of sanctity in the lifetime of Shah Wali Allah. Further, the annotative efforts of Shah Wali Allah rectified and enriched the juristic place of Auragzeb Alamgir not only in the Subcontinent but at all academies, institutes and Madaris of the entire Muslim world.

The selection of Fatawa Alamgiria as the main source in the galaxies of Fatawa literature produced in the Subcontinent, is due to its micro investigation and empirical observation to the socio-economic and religious situation of the multi-cultural Sub-continent.

The paper reveals that among the collective references of Hidayah, Nur Al-Anwar, Sharh Al-Sunnah, Al-Minhaj and Alamgiria in Al-Musawwa, only the latter has its 80 per cent share in the total citation of 72 places, in which only 29 references of Alamgiria have been elaborated in the present study. It simultaneously throws light on a comparative study of Al-Musawwa and Al-Musaffa, the two commentaries of Al-Muwatta in Arabic and Persian based on The extract of Masudi, the closest student of Imam Malik.

Ijtihad and its Historical Development

Prof. Mohammad Anas Hassan
Govt. Degree College, Jahaniyan, Pakistan
anskashmiri@gmail.com

In the light of Quran and Sunnah, to inquire about new order by utilising the utmost efforts is called ijtihad. We know that the world is changing rapidly and every new day comes with new issues. In this situation there are two ways for the Muslims.

One, with reference to the solution of these modern issues, they stand by old issues and inquiries.

Two, they suggest the solution of modern issues according to the instructions of Holy Quran and Sunnah. Certainly the survival and progress is possible only when that they proceed further with the tradition of ijtihad collectively.

Ijtihad is not self created suggestions while putting behind the Quran. But it has been the tradition of Muslims since the reign of

Prophet (PBUH) and remained applicable in different eras of Muslims in different shapes. But today we have been deprived of the true sense of ijtihad in this era of downfall. This research article is an effort of this thought awakening purpose.

Shaikh Muhammad Al-Ghazali and his book Fiqh al-Seerah-An Introduction

Dr. Safdar Sultan Islahi
Associate Professor, Dept. of Kulliyat,
Tibbiya College, AMU, Aligarh
& Secretary Idara-e-Tahqeeq-o-Tasneef-e-Islami, Aligarh

Shaikh Muhammad Al-Ghazali (1917-1996) was a renowned Alim, outstanding thinker and great writer of the contemporary age. His writings reflect quality research. He is widely known in the Arab and Islamic world as a great pioneer of Islamic thought and active leader of the Islamic Movement. He has left behind a treasure of invaluable works on the various aspects of Islam. Among them, his masterpiece Fiqh al-S?rah is especially worth mentioning. Describing in brief great and important incidents in the Prophet's S?rah, this book presents extracted teachings and commandments in a way that a study thereof acquaints the readers of the ways to lead life in the present age and of the solutions to present problems. The writer has made the Qur'?n and the Prophet's Sunnah source of this book. He has portrayed the Prophet (peace and blessings of Allah be to him) as the Prefect Man, a study of whose life gives us impetus to follow and obey him. This book also rebuts the objections raised to the Prophet's S?rah.

In this article, a study of this book from the above mentioned aspects has been made.

Some Female Quran Interpretators in Contemporary Era

Afaf Abdul Ghafoor Hameed
Asstt. Prof. Dept. of Tafseer & Uloom Al-Quran
Faculty of Shariah and Islamic Studies, University of Sharjah (U.A.E.)
Tr.Nadeem-e- Sahar Ambareen
Research scholar, Dept. of Islamic Studies
Jamia Millia Islamia, New Delhi
Nadeemamber90@gmail.com

The Holy Quran calls unto men and women equally as women ought to carry the responsibility of conveying the message of Allah as men do. This comes through learning, memorization, studying and comprehending. Therefore, since the upcoming of Islam, women have contributed to carrying on this responsibility well.

At present, what we have of women works such as writing and authoring in the field of interpretation is countable. The previous scholars did not dedicate a single book about women efforts in Quran interpretation. That was recorded in various scattered narrations in biographies. This implies that women have at least little contributions but certainly not absent.

Therefore, this paper explores and identifies three women efforts in interpreting the Quran:

1. Dr. Aisha Abdul Rahman bint Al-shati
2. Zainab Al-Ghazali Al-jubeeli
3. Hanan Laham

BOOK REVIEWS

1. ***Nisaiyat*** (Issues about women) Dr Mohammad Shakil Auj; 2012; Pages: 306; Price Rs 500/- Pakistani
   Reviewed by Mohammad Raziul Islam Nadvi
2. ***Darul Musannifin ki Arabi Khidmat*** (The Contribution of Darul Musannifin in the Arabic Language) Dr Mohammad Arif Umari; 2013; pages 272, Price IRs.300/-
   Reviewed by Mohammad Raziul Islam Nadvi